# شیطان

سعادت حسن منٹو



ساقی بک ڈپو

اردو بازار، دہلی 110006-

○ میں اُسے واحد ایسا ادیب ا
سمجھتا رہا ہوں جس میں فن ا

○ مز

قیمت ـــــــــ اٹھارہ روپے ۱۸ر



طابع ـــــــــ ٹائمز پریس ـ نئی دہلی ۲

ناشر :
ساقی بک ڈپو
اردو بازار ، دہلی ـ 110006

SHAITAN SAADAT HASAN MANTOO Rs 18/

SAQI BOOK DEPOT, URDU BAZAR, DELHI-110006

# کٹاری

پوری تفصیلات کے ساتھ فلمی کہانی

۵

فلم کے عنوانات ختم ہوتے ہیں ــــــ آخری عنوان کے عقب میں "بہارستان"
کا ٹریڈ مارک ہے ــــــ ایک پھول اور دو کلیاں ــــــ ہم ڈزالو
کرتے ہیں۔

---

بڑی سرکار کی حویلی سے ملحقہ باغ
ٹریڈ مارک کا پھول اور کلیاں، اصلی شکل اختیار کر لیتی ہیں ــــــ کیمرہ
پیچھے ہٹتا ہے ــــــ مالی پھول چُن رہا ہے۔ کچھ عرصہ اسی طرح مشغول
رہنے کے بعد وہ اپنی دائیں طرف دیکھتا ہے ــــــ کیمرہ اور پیچھے ہٹتا ہے۔

مالی : (دائیں طرف دیکھتے ہوئے) چمیلی!

کیمرہ بین ہوتا ہے ــــــ مالی کی لڑکی جو کہ چل رہی تھی، رُک جاتی ہے۔

مالی : سرکار آنے والے ہیں ــــــ جا کپڑے بدل لے۔

چمیلی اپنے میلے کپڑوں کی طرف دیکھتی ہے۔

چمیلی : اچھا۔!

یہ کہہ کر وہ چلتی ہے ــــــ کٹ کر کے ہم مالی پر آتے ہیں۔ وہ پُر اسرار انداز
میں چمیلی کی طرف دیکھتا ہے ــــــ زیر لب مسکراتا ہے اور پھر پھول توڑنے

میں مصروف ہو جاتا ہے۔

بڑی سرکار کی حویلی (گیراج)

گیراج کے باہر ٹاٹ لٹک رہا ہے —— چمیلی اِسے ہٹا کر اندر داخل ہونے ہی والی ہے کہ موٹر سائیکل کے انجن کی پھٹ پھٹ سنائی دیتی ہے۔ ایک لمحے کے لئے چمیلی رُکتی ہے۔ پھر اندر گیراج میں چلی جاتی ہے —— کیمرہ ٹاٹ کے سامنے ٹکا رہتا ہے۔ موٹر سائیکل کی آواز قریب تر ہو جاتی ہے —— دفعتہً کیمرہ ایک دم پیچھے ہٹتا ہے —— عقب میں ایک موٹر سائیکل نمودار ہوتی ہے جس پر چھوٹی سرکار سوار ہیں۔ موٹر سائیکل گیراج کے اندر چلی جاتی ہے —— چمیلی کی چیخ کی آواز۔

---

بڑی سرکار کی حویلی سے ملحقہ باغ

ہم کٹ کر کے مالی کا ردِعمل دکھاتے ہیں۔

---

بڑی سرکار کی حویلی (گیراج)

ہم واپس گیراج پر آتے ہیں —— ٹاٹ کا پردہ ہٹتا ہے —— چھوٹی سرکار باہر نکلتا ہے۔ مضطرب حالت میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہے مالی کی آواز آتی ہے۔

مالی : آگئے چھوٹی سرکار۔

چھوٹی سرکار: (مضطرب حالت میں مالی کی طرف بڑھتا ہے) ہاں آگیا —— میرا مطلب ہے، موٹر سائیکل ...... میرا مطلب ہے چمیلی ......

مالی : چمیلی حضور۔

چھوٹی سرکار: نہیں نہیں —— بڑی سرکار کہاں ہیں۔

حضور، مینڈھے دیکھ رہے ہیں۔

چھوٹی سرکار: (جیسے خالی الذہن ہے) مینڈھے؛ (گیراج کی طرف دیکھتا ہے)

مالی : جی ہاں!

چھوٹی سرکار: اچھی بات ہے ——

یہ کہہ کر چھوٹی سرکار ایک طرف چلا جاتا ہے —— مالی پُراسرار طریقے پر زیرِ لب مسکراتا ہے۔

---

بڑی سرکار کی حویلی (اکھاڑہ)

تین چار مینڈھے کھڑے ہیں۔ کالو پہلوان ایک مینڈھے کے مہندی لگا رہا ہے —— بڑی سرکار ایک مینڈھے کے سینگ دیکھ رہا ہے۔ پاس منشی کھڑا ہے۔

بڑی سرکار : منشی صاحب۔

منشی : حضور۔

بڑی سرکار : اس کے جوڑ کا مینڈھا پیدا ہوا ہے نہ ہوگا۔

منشی : جی ہاں۔

کالو : حضور، آپ کے اس غلام نے جتنی محنت اس جنور پر کی ہے ......

بڑی سرکار : (بات کاٹتے ہوئے) اور جو دولت ہم نے صرف کی ہے ... (ایک طرف دیکھ کر) آؤ بھئی آؤ ــــــ کب آئے۔

چھوٹی سرکار نمودار ہوتا ہے۔

منشی : آداب عرض چھوٹی سرکار۔

کالو : آداب عرض حضور۔

بڑی سرکار : (مینڈھے کے سینگوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے) کب آئے؟

چھوٹی سرکار : (دماغ ابھی تک مضطرب ہے) جی؟ ــــــ (چونک کر) بس آہی رہا ہوں۔

بڑی سرکار : اس کا یہ مطلب ہے کہ تم پورے طور پہ ابھی تک نہیں آئے (ہنستا ہے)

چھوٹی سرکار ہنسنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔

بڑی سرکار : (کالو سے) پھول ذرا خوبصورت بناؤ .... (چھوٹی سرکار) ہاں بھئی تعلیم و علیم تو ختم ہوئی ــــــ اب کیا ارادہ ہے؟

منشی : شکار کھیلا کریں گے۔

بڑی سرکار : (معنی خیز لہجے میں ــــــ مینڈھے کے سینگوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے) شکار

تو کالج میں بھی کھیلتا رہا ہوگا۔ (ہنستا ہے) کیوں ؟

چھوٹی سرکار: جی !

بڑی سرکار: (چھوٹی سرکار کے کاندھے پر تھپکی دیتے ہوئے) جاؤ، جاؤ، آرام کرو۔

چھوٹی سرکار جانے لگتا ہے۔

منشی : چھوٹی سرکار گلاب نہیں آیا ؟

چھوٹی سرکار: نہیں ـــــ دو تین روز کے بعد آئے گا ـــــ چمیلی

بڑی سرکار: (ایک دم) چمیلی ؟

چھوٹی سرکار: جی نہیں ـــــ میرا اسباب ـــــ میرا سامان اِدھر اُدھر بکھرا پڑا تھا ـــــ اکٹھا کر کے ٹرک میں لائے گا۔

بڑی سرکار: (کالوسے) پھول ذرا خوبصورت بناؤ۔

چھوٹی سرکار چلا جاتا ہے۔ سر کھجاتا ہُوا۔

---

بڑی سرکار کی حویلی (چھوٹی سرکار کا کمرہ۔ بیرونی حِصّہ)

چھوٹی سرکار اسی طرح سر کھُجاتا کمرے کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔

---

بڑی سرکار کی حویلی (چھوٹی سرکار کا کمرہ، بیرونی حصہ)

چھوٹی سرکار اپنی بُش شرٹ اتار کر ایک طرف پھینک دیتا ہے۔ سیٹی بجانا شروع کرتا ہے اور ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھتا ہے۔ کنگھی اٹھا کر بالوں

میں پھیرتا ہے۔ تھوڑے وقفے کے بعد اُسے آئینے میں چمیلی کا عکس نظر آتا ہے ——— ردِ عمل ——— مُڑتا ہے۔

چھوٹی سرکار: چمیلی۔

چمیلی گلدان میں پھول سجا رہی ہے۔ ایک دم شرما جاتی ہے۔

چھوٹی سرکار چمیلی کی طرف بڑھتا ہے ——— چمیلی ایک طرف سمٹ جاتی ہے۔

چھوٹی سرکار: مجھے معلوم نہیں تھا تم اتنی خوبصورت ہو۔

چمیلی کا ہاتھ پکڑنا چاہتا ہے ——— چمیلی کے ہاتھ سے پھول گر جاتے ہیں۔

چمیلی : (شرما کر) چھوٹی سرکار۔

چھوٹی سرکار: تم ڈر کیوں گئی تھیں؟ (ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔)

چمیلی : (ہاتھ چھڑا کر) چھوڑ دیجیے مجھے۔

ایک طرف ہٹتی ہے ——— چھوٹی سرکار اس کی طرف بڑھتا ہے ——— چمیلی تیزی سے کمرے سے باہر نکل جاتی ہے۔

---

بڑی سرکار کی حویلی (چھوٹی سرکار کا کمرہ ——— بیرونی حصہ)

چمیلی باہر نکلتی ہے ——— اس کی مڈبھیڑ منشی سے ہوتی ہے ——— منشی کا ردِ عمل ——— چمیلی ایک دم رُک جاتی ہے ——— اندر

سے چھوٹی سرکار کی آواز آتی ہے ——

چمیلی، چمیلی

چمیلی تیز قدمی سے چلی جاتی ہے —— چھوٹی سرکار باہر نکلتا ہے ——

چھوٹی سرکار: چمیلی (منشی کو دیکھ کر) اوہ!

منشی : (تھوڑے توقف کے بعد) حضور آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو .....

چھوٹی سرکار: ضرورت؟ —— نہیں

یہ کہہ کر وہ اندر چلا جاتا ہے۔

---

بڑی سرکار کی حویلی (چھوٹی سرکار کا کمرہ —— (بیرونی حصّہ)

چھوٹی سرکار دہلیز میں کھڑا ہو کر کچھ سوچتا ہے۔ پھر بالوں میں کنگھی کرتا ہُوا آگے بڑھ جاتا ہے —— ایک دم اس کی نگاہیں تپائی پر رکھے ہوئے ننگے بُت پر پڑتی ہیں —— ردِّ عمل —— مسکراتا ہے اور بُت کو دیکھتا ہُوا آگے بڑھ جاتا ہے —— کنگھی کرتا کرتا آرام کرسی پر بیٹھ جاتا ہے —— کنگھی بالوں میں اڑسی رہتی ہے —— تپائی کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے جس پر میگزین پڑے ہیں —— ایک میگزین اٹھاتا ہے —— سرورق پر نہانے کے لباس میں ایک عورت کی تصویر چھپی ہے —— اس کو دیکھ کر مسکراتا ہے —— رسالہ ہاتھ میں لئے

اٹھتا ہے اور کھڑکی کی طرف جاتا ہے ــــــــ باہر گیراج نظر آتا ہے جس پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہے ــــــــ چمیلی اُسے ہٹاکر اندر داخل ہورہی ہے۔ چھوٹی سرکار میگزین کے سرِورق کی طرف دیکھتا ہے۔

---

بڑی سرکار کی حویلی (گیراج)

ٹاٹ کے پردے پر سرورق کی تصویر پھیل جاتی ہے۔

---

بڑی سرکار کی حویلی (گیراج)

ٹاٹ کے پردے پر سے میگزین کے سرورق کی نیم برہنہ تصویر آہستہ آہستہ غائب ہو جاتی ہے ــــــــ پردے میں جنبش پیدا ہوتی ہے ــــــــ چمیلی باہر نکلتی ہے ــــــــ چند قدم چلتی ہے اور رُک کر ایک طرف دیکھتی ہے۔

---

بڑی سرکار کی حویلی (ٹینس کورٹ)

چھوٹی سرکار اور بڑی سرکار ٹینس کھیل رہے ہیں ــــــــ چھوٹی سرکار ایڑھیاں اونچی کر کے چمیلی کی طرف دیکھتا ہے ــــــــ بڑی سرکار گیند پھینکتا ہے۔ چھوٹی سرکار اُسے ہٹ لگاتا ہے۔

---

بڑی سرکار کی حویلی (گیراج)
گیند چمیلی کے لگتی ہے۔ اس کا ردِ عمل

---

بڑی سرکار کی حویلی (ٹینس کورٹ)

بڑی سرکار: (چھوٹی سرکار سے) شکار شروع کر دیا۔

چھوٹی سرکار: (بوکھلا جاتا ہے) جی نہیں —— وہ تو......

بڑی سرکار: (ہنستا ہے —— چمیلی کی طرف مڑ کر) چمیلی گیند لا ادھر

چمیلی گیند اٹھا کر لاتی ہے۔

بڑی سرکار: چمیلی —— تو نے چھوٹی سرکار کی گیند اپنی طرف کیوں کھینچی۔

چمیلی : (کچھ سمجھتی نہیں) جی۔

بڑی سرکار: (قہقہہ لگاتا ہے اور چمیلی کے ہاتھ سے گیند لے لیتا ہے) جا بھاگ جا۔

چمیلی چلی جاتی ہے۔ بڑی سرکار، چھوٹی سرکار سے مخاطب

ہوتے ہیں۔

بڑی سرکار: نشانے کے تم کافی پکے ہو نا؟

چھوٹی سرکار: (جھینپ کر) جی نہیں ..... وہ تو......

بڑی سرکار: (قہقہہ لگاتا ہے اور گیند چھوٹی سرکار کی طرف پھینکتا ہے۔

چھوٹی سرکار گیند، ریکٹ پہ اٹھا لیتا ہے اور سر جھکا کر اسے اُچھالنا

شروع کر دیتا ہے۔

بڑی سرکار کی حویلی ——— (باغ کا فوارہ)

ہم ڈزالو کرتے ہیں ——— چمیلی کا کلوز اپ ——— کیمرہ پیچھے ہٹتا ہے ——— چمیلی بغیر اوڑھنی کے کھڑی ہے ——— اوڑھنی چھوٹی سرکار کے ہاتھ میں ہے۔

چمیلی : (دونوں ہاتھوں سے سینہ ڈھانپتے ہوئے) میرا دوپٹہ دے دیجئے چھوٹی سرکار۔

چھوٹی سرکار: (شرارت کے ساتھ) ہم نہیں دیں گے۔

چمیلی : کوئی دیکھ لے گا ——— بدنام ہو جاؤں گی۔ چھوٹی سرکار۔

چھوٹی سرکار: تم خواہ مخواہ ڈرتی ہو۔

چمیلی : اس روز ——— اس روز بڑی سرکار کیا کہہ رہے تھے ——— لائیے دوپٹہ۔

چھوٹی سرکار: (آگے بڑھ کر) لو۔

چمیلی دوپٹہ لینے کے لئے ہاتھ بڑھاتی ہے۔

چھوٹی سرکار: ٹھہرو ——— میں ٹھیک طرح سے اوڑھائے دیتا ہوں۔

چھوٹی سرکار چمیلی کو دوپٹہ اس طرح اوڑھاتا ہے کہ اُڑے نہیں ——— اس کے بعد وہ اسے بازو سے پکڑتا ہے۔

چھوٹی سرکار: چلو آؤ۔ تمہیں موٹر سائیکل کی سیر کرائیں۔

چمیلی : نہیں۔ چھوٹی سرکار نہیں۔

چھوٹی سرکار اس کو بازو سے کھینچتا ہُوا لے جاتا ہے۔ کچھ فاصلے پر ان کی مڈبھیڑ مالی سے ہوتی ہے۔ دونوں رُک جاتے ہیں۔

چھوٹی سرکار: موٹر سائیکل کی ——— چمیلی کو موٹر سائیکل کی سیر کرانے لے جا رہا ہوں۔

مالی : لے جائیے حضور۔

چھوٹی سرکار: (چمیلی سے) آؤ چمیلی۔

چمیلی کھڑی رہتی ہے۔

مالی : جاؤ چمیلی ——— چھوٹی سرکار کی بڑی مہربانی ہے۔

چھوٹی سرکار: مہربانی کیسی ——— آؤ چمیلی۔

چمیلی کو ساتھ لے جاتا ہے ——— مالی پُر اسرار طور پر زیرِ لب مُسکراتا ہے۔

---

بڑی سرکار کی حویلی (گیراج)

پردہ ہٹتا ہے ——— اندر سے موٹر سائیکل باہر نکلتی ہے۔ چھوٹی سرکار اُسے چلا رہا ہے ——— پیچھے سیٹ پر چمیلی بیٹھی ہے ——— موٹر سائیکل حویلی سے باہر نکلتی ہے۔

---

کھیت۔

ہم ڈزالو کرتے ہیں۔

موٹر سائیکل ایک طرف پڑی ہے ـــــــ ٹائر پہ سر رکھ کر چھوٹی سرکار لیٹا ہے ـــــــ چمیلی ایک طرف سمٹی بیٹھی ہے۔ ہاتھ سے سائیکل کے کل پرزوں کو چھیڑ رہی ہے۔

چھوٹی سرکار : چلو آؤ، نہر میں نہائیں۔

چمیلی : (ایک دم چونک کر) کیا؟

چھوٹی سرکار : کالج میں لڑکے لڑکیاں اکٹھے نہاتے ہیں۔

چمیلی : (شرما کر دوپٹے سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیتی ہے۔) آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔

چھوٹی سرکار : (اُٹھ کر چمیلی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے) تم بتاؤ کیسی باتیں کروں۔

چہرے پر سے دوپٹہ ہٹاتا ہے۔

چھوٹی سرکار : ایک منہ نظر آتا تھا وہ بھی چھپا لیا۔

چمیلی کا ہاتھ غیر ارادی طور پر ہارن کے بٹن پر پڑتا ہے جو بج اٹھتا ہے ـــــــ

چمیلی اوئی کر کے اُچک کر کھڑی ہو جاتی ہے ـــــــ چھوٹی سرکار ہنسنا شروع کر دیتا ہے۔

چمبیلی : (دل پہ ہاتھ رکھتی ہے)

چھوٹی سرکار اٹھ کر چمبیلی کے پاس جاتا ہے۔

چھوٹی سرکار: کیا ہُوا دل کو؟

چمبیلی : دھک دھک کر رہا ہے۔

چھوٹی سرکار: سُنوں؟

یہ کہہ کر وہ اس کی کمر میں اپنا بازو حمائل کر دیتا ہے اور کان سینے پر جمانے ہی والا ہے کہ چمبیلی تڑپ کر ایک طرف ہٹ جاتی ہے —— چہرے پہ ایک عجیب قسم کا خوف و ہراس پیدا ہو جاتا ہے —— چھوٹی سرکار آگے بڑھتا ہے اور چمبیلی کو پکڑنا چاہتا ہے۔

چمبیلی : (کانپتی آواز میں) نہیں نہیں —— مجھے ہاتھ مت لگائیے چھوٹی سرکار...

چھوٹی سرکار: (چمبیلی کی طرف بڑھتے ہوئے) چمبیلی۔

چمبیلی : نہیں —— نہیں —— نہیں۔

تیزی سے بھاگ جاتی ہے —— چھوٹی سرکار وہیں کھڑا رہ جاتا ہے۔

چھوٹی سرکار: عجیب لڑکی ہے.... (مُسکراتا ہے)

مسکراتا ہُوا چھوٹی سرکار اپنی موٹر سائیکل کی طرف آتا ہے۔ اسے اٹھاتا ہے —— ہارن بجا کر مسکراتا ہے۔ —— ایک دم فائرنگ کی

آواز آتی ہے ——— چھوٹی سرکار کے ہاتھ سے موٹر سائیکل گر جاتی ہے ——— رائفل ہاتھ میں لئے ہوئے بڑی سرکار، کالو پہلوان کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔

بڑی سرکار: کیوں بھئی، کیا ہو رہا ہے یہاں؟

چھوٹی سرکار: جی ——— کچھ نہیں ——— ایسے ہی چلا آیا تھا۔

بڑی سرکار: شکار کھیلنے کے لئے؟

چھوٹی سرکار: جی نہیں ——— ایسے ہی گھومنے کے لئے۔

بڑی سرکار: (مسکرا کر) گھومو..... (کالو سے) چلو کالو۔

کالو اور بڑی سرکار چلے جاتے ہیں ——— چھوٹی سرکار اپنی موٹر سائیکل اٹھاتا ہے۔

---

فیڈ آؤٹ

---

خانہ بدوشوں کا ڈیرا۔

ہم فیڈ اِن کرتے ہیں۔

ایک لڑکی کی ٹانگیں نظر آتی ہیں جو "کبڈی کبڈی" بولتی جا رہی ہے ——— کیمرہ پیچھے ہٹتا ہے اور دکھاتا ہے کہ جیسی لڑکیاں کبڈی کھیل رہی ہیں

یہ لڑکی جب مخالف گروپ میں پہنچتی ہے تو پکڑی جاتی ہے ـــــ اور "مارکر" ایک طرف بٹھا دی جاتی ہے ـــــ وفعتہً "کٹاری کٹاری کی آواز آتی ہے ـــــ ہماری ہیروئن تھرکتی ناچتی "کٹاری کٹاری" کی گردان کرتی مخالف گروپ میں تیر کی طرح داخل ہوتی ہے ـــــ یہاں سے موسیقی شروع ہوتی ہے اور کٹاری کھیل کھیل میں رقص کرتی گاتی تھرکتی مخالف گروپ کی لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتی ہے ـــــ آخر میں مخالف گروپ کی ایک پست قد لڑکی "تتلی" جرأت سے کام لے کر کٹاری سے لپٹ جاتی ہے ـــــ کٹاری اسے گھسیٹتی ہوئی لکیر تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے، مگر وہ کچھ اس طرح کٹاری سے چمٹی ہوئی ہے کہ دونوں لکیر کے پاس گر پڑتی ہیں ـــــ تتلی اٹھ کر چلانا شروع کر دیتی ہے ـــــ

تتلی : کٹاری مر گئی ـــــ کٹاری مر گئی۔

کٹاری : (جو ابھی تک کٹاری کٹاری کئے جا رہی ہے) کیا؟

مخالف گروپ کی لڑکیاں : (بیک زبان) کٹاری مر گئی، کٹاری مر گئی۔

کٹاری غضب ناک ہو کر اٹھتی ہے اور تتلی کی چٹیا پکڑ لیتی ہے۔

کٹاری : کیا کہتی ہے تتلی کی بچی ـــــ کٹاری مر گئی؟

تتلی : ہاں ـــــ تو مر گئی ہے۔

کٹاری : بکتی ہے تو۔

تتلی : تیرا سانس ٹوٹ گیا تھا۔

کٹاری : میرا سانس تو مرتے وقت بھی نہیں ٹوٹے گا ——— الفتی کہیں کی۔

تتلی : تو الفتی۔

کٹاری : (تتلی کے چانٹا لگاتی ہے)

تتلی وحشی بلی کی طرح کٹاری پر حملہ کرتی ہے، کٹاری اس کا جواب دیتی ہے۔

اب باقاعدہ لڑائی شروع ہو جاتی ہے ——— کٹاری اسے دبا لیتی ہے۔

کٹاری : بتا اب، کیا میرا سانس ٹوٹا تھا۔

تتلی : (ڈر کر) نہیں ——— نہیں۔

کٹاری اسے چھوڑ دیتی ہے ——— تتلی اُٹھتی ہے۔

تتلی : تمہارا سانس ایک بار نہیں۔ سو بار ٹوٹا تھا۔

منہ میں سے جیب نکال کر کٹاری کو دکھاتی ہے اور بھاگ جاتی ہے

کٹاری اس کا تعاقب کرتی ہے۔

تعاقب کے مختلف شوٹ

---

سڑک

سڑک کے عین بیچ کٹاری، تتلی کو دبوچ لیتی ہے۔ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو جاتی ہیں —— ایک دم بریک لگنے کی چیخ سنائی دیتی ہے —— ایک لاری ان کے بالکل پاس پہنچ کر رکتا ہے —— گلاب ڈرائیو کر رہا ہے۔

گلاب : (لڑکیوں سے) اے، اے ...... شش ...... اے اس کی کوئی نہیں سنتا —— لاری سے باہر نکلتا ہے۔

گلاب : اے، اے ... یہ کیا ہو رہا ہے۔

کٹاری : (دھینگامشتی بند کر کے گلاب کی طرف دیکھتے ہوئے) اندھے ہو؟ —— دیکھتے نہیں لڑائی ہو رہی ہے۔

یہ کہہ کر کٹاری پھر لڑائی میں مشغول ہو جاتی ہے —— گلاب مسکراتا ہے اور ان کو چھڑانے کی کوشش کرتا ہے —— مگر اس کوشش میں اس کے بھی تین چار چانٹے، دس پندرہ لاتیں اور چھ سات مکّے حصے میں آجاتے ہیں۔ بالآخر وہ دونوں کو چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا ہے —— اس دوران میں دوسری لڑکیاں آجاتی ہیں۔

گلاب : میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تم لڑ کیوں رہی ہو۔

کٹاری : اس نے کہا تھا کہ میرا سانس ٹوٹ گیا تھا۔

گلاب : سانس؟

کشاری : (گلاب سے) ، تم بتاؤ کیا میرا سانس ٹوٹ سکتا ہے ؟

گلاب : (کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کیا جواب دے) ،

کشاری : جلدی بتاؤ، کیا میرا سانس ٹوٹ سکتا ہے ؟

تتلی : اس پر تمہارا رعب نہیں چلے گا کشاری ـــــــ تم سے بہت زیادہ طاقت ور ہے ۔

کشاری : مجھ سے زیادہ کوئی بھی طاقت ور نہیں ہو سکتا ۔

تتلی : مرد ہے

کشاری : میں مردوں کو کیا سمجھتی ہوں ۔

تتلی : گردن مروڑ دے گا ۔

کشاری : اونہہ ـــــــ میری کلائی ہی مروڑ کر دکھائے ـــــــ (کلائی گلاب کی طرف بڑھاتی ہے) ، لو پکڑو ۔

گلاب : (مناسب و موزوں ردِّ عمل)

کشاری : پکڑو ۔

سب لڑکیاں : (گلاب سے) ، پکڑو ۔

کشاری : پکڑتے کیوں نہیں ـــــــ پکڑو ـــــــ اور دیکھو، ان دو انگلیوں سے کیسے تمہارا ہاتھ جھٹک کر اپنی کلائی چھڑاتی ہوں ـــــــ پکڑو ۔

گلاب : موج آجائے گی۔

کٹاری : ارے واہ رے میرے رستم پہلوان۔

تتلی : کچھ شرط لگاؤ تو پکڑے بھی۔

کٹاری : (گلاب سے) لگاؤ شرط۔

تتلی : کتنے کی؟

کٹاری : رہی ایک ایک روپے کی۔

تتلی : ایک روپیہ تو یہ بخشش دے گا تمہیں ـــــ سو سو روپے کی مانو تو کوئی بات بھی ہو۔ (گلاب سے) کیوں بابو؟

سب لڑکیاں : رہی۔ رہی۔

گلاب مسکراتا ہے۔

کٹاری : رہی سو سو روپئے کی ..... (کلائی بڑھا کر) لو پکڑو۔

گلاب : جانے دو۔

کٹاری : پکڑو بابو ـــــ جلدی فیصلہ ہو۔

گلاب : (مسکرا کر کلائی ہاتھ میں لیتا ہے) کیسی خوبصورت کلائی ہے۔

کٹاری : وہ تو ہے ـــــ تم یہ دیکھنا چھڑاتی ہوں کس خوبصورتی سے۔

گلاب : جو خوبصورت ہے، اس کی ہر چیز خوبصورت ہوگی۔

کٹاری : تو دیکھ لو نا؟

گلاب : (مذاقاً کلائی دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیتا ہے)

کٹاری : (تتلی سے) تتلی بس اتنا ہی زور ہے تمہارے رستم میں۔

تتلی : (گلاب سے) ذرا ایک پیچ دو۔

گلاب گرفت ذرا مضبوط کر دیتا ہے۔

کٹاری : بس؟ چھڑاؤں۔

گلاب ایک دم گرفت مضبوط کر لیتا ہے۔

کٹاری : اوئی!

گلاب گرفت ڈھیلی کر دیتا ہے ——— کٹاری فائدہ اٹھاتی ہے اور کھٹ سے ہاتھ مار کر اپنی کلائی چھڑا لیتی ہے ——— لڑکیاں شور مچا دیتی ہیں۔

کٹاری : دہ مارا۔

گلاب : (مسکرا کر) کیا مارا؟

کٹاری : چھڑا لی کلائی۔

گلاب : کب چھڑائی، کیسے چھڑائی؟

تتلی : بابو، چھڑا تو لی۔

باقی لڑکیاں چلاتی ہیں۔ "چھڑا لی، چھڑا لی"۔

گلاب : کیا؟

تتلی : شرط ہاری ــــــ دو روپئے۔

کٹاری : اس طرح نہیں دے گا ــــــ (لڑکیوں سے ) ایک ــــ دو ــــــ پکڑلو۔ سب لڑکیاں گلاب کو پکڑ لیتی ہیں۔ کٹاری اُچک کر گلاب کی جیب سے سارے نوٹ نکال لیتی ہے۔

کٹاری : اوہ ــــــ یہ تو کافی سارے ہیں۔

گلاب : (جھنا کر) اُچکیو، شہدیو، چھوڑو مجھے۔

کٹاری : چھوڑ دو۔ (سو روپئے کا ایک نوٹ نکال کر اپنے گھگھرے میں اڑس لیتی ہے) دیکھ لو، ایک کوڑی زیادہ نہیں لی ــــــ لو۔ تتلی آگے بڑھ کر ایک روپئے کا نوٹ چھین لیتی ہے۔

تتلی : ایک روپیہ میں لوں گی۔

کٹاری : واپس کر دو تتلی۔

تتلی : واہ ــــــ میں نے اتنی مار کھائی ہے۔

کٹاری : اچھا، رکھو اپنے پاس ــــــ بقایا نوٹ گلاب کو دیتی ہے) لو۔ (ایک دم لڑکیوں سے ) ایک ــــــ دو ــــــ بھاگو۔ سب بھاگ جاتی ہیں۔ گلاب نوٹ پکڑ کر بھونچکا رہ جاتا ہے۔

گلاب : لٹیرن کہیں کی ــــــ
کٹاری کے تعاقب میں بھاگتا ہے۔

تعاقب کے مختلف شوٹ ۔

---

خانہ بدوشوں کا ڈیرا (ڈمرو کا خیمہ ——— بیرونی حصّہ)

کٹاری تیزی سے اندر خیمے میں داخل ہوتی ہے ۔

خانہ بدوشوں کا ڈیرا (ڈمرو کا خیمہ —— اندرونی حصّہ)

ڈمرو چٹائی پر لیٹا ہے ——— چھت کا پنکھا ہل رہا ہے

کٹاری ڈمرو کو جگاتی ہے ۔

کٹاری : ڈمرو، ڈمرو۔

ڈمرو : جا، جا۔ سونے دے مجھے۔

باہر سے گلاب کی آواز آتی ہے ۔

گلاب : کٹاری۔

کٹاری نوٹ نکال کر ڈمرو کے ہاتھ میں دیتی ہے ۔

کٹاری : لے سنبھال اسے ۔

یہ کہہ کر وہ تیزی سے ایک طرف چلی جاتی ہے ۔

ڈمرو : کیا ہے؟

گلاب کی آواز آتی ہے ۔

گلاب : کٹاری۔

ڈمرو مٹھی کھول کر سو کا نوٹ دیکھتا ہے ـــــــ ردِ عمل ـــــــ اور

زیادہ آنکھیں کھولتا ہے ـــــــ ساتھ ہی باچھیں کھل جاتی ہیں ـــــــ

نوٹ کو چومتا ہے۔

گلاب : کٹاری۔

---

خانہ بدوشوں کا ڈیرا ڈمرو کا خیمہ ـــــــ بیرونی حصّہ )

گلاب باہر کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہے ـــــــ ایک کھونٹے کے سامنے

ھینڈھا بندھا ہے۔ دوسرے کے ساتھ ریچھ ـــــــ ایک کتا ہے جو منہ میں

رسّی لیے کبھی ادھر کھینچتا ہے کبھی ادھر۔ یہ رسّی تنبو میں چلی گئی ہے ـــــــ

گلاب خیمے کے اندر داخل ہوتا ہے

---

خانہ بدوشوں کا ڈیرا (ڈمرو کا خیمہ ـــــــ اندرونی حصّہ )

ڈمرو نوٹ کو گھور گھور رہا ہے۔

گلاب : کٹاری۔

ڈمرو : آؤ ـــــــ آؤ۔

گلاب : (نوٹ دیکھ کر) یہ نوٹ ـــــــ یہ نوٹ میرا ہے۔

ڈمرو : تمہارا ہے؟ ـــــــ تو میرے پاس کیسے چلا آیا۔

گلاب : (پاس جاکر) وہ لڑکی جو ابھی اندر گئی تھی، اس نے تمہیں دیا ہے۔

ڈمرو : اس نے کہاں سے لیا یہ نوٹ۔

گلاب : مجھ سے چھین کر لے آئی ہے۔

ڈمرو : الفیا؟

گلاب : لاؤ نوٹ دو مجھے۔

ڈمرو : ارے بھائی اتنی جلدی کیا کرتے ہو ـــــــ آؤ بیٹھو، چائے پانی پیو۔

(آواز دیتا ہے) بیگم ـــــــ سگرٹ تو لانا۔

گلاب : تم نوٹ لاؤ۔

ڈمرو : ٹھہرو، مجھے چشمہ لگا کر دیکھنے دو۔

ڈبیہ سے چشمہ نکالتا ہے ـــــــ دھوتی کے پلّو سے صاف کرتا ہے۔ مگر اس کے شیشے ہی نہیں ـــــــ گلاب دلچسپی لیتا ہے۔

گلاب : کیسا ہے یہ چشمہ۔

ڈمرو : اول نمبر۔

ایک بندریا آتی ہے اور سلگا ہوا سگرٹ ڈمرو کو دیتی ہے۔

ڈمرو : لو، سگرٹ پیو۔

گلاب : میں نہیں پیتا ـــــــ تم نوٹ حوالے کرو میرا۔

ڈمرو : مجھے دیکھنے دو۔ (چشمہ لگاتا ہے) ارے ——— یہ تو کھوٹا ہے۔

گلاب : کھوٹا کھرا جیسا ہے، ٹھیک ہے ——— لاؤ۔

ڈمرو : لو ابھی پتہ چل جاتا ہے ——— میں چھُو کرتا ہوں ——— کھوٹا ہوگا تو یوں اُڑ جائے گا (مٹھی بند کرکے چھُو کرتا ہے ——— پھر مٹھی کھولتا ہے ——— نوٹ غائب ہے) کیوں دوست اب بھی نہیں مانوگے۔

گلاب : تم سب چور ہو ——— اٹھائی گیرے ——— ڈاکو ——— کہاں ہے وہ لڑکی۔

ڈمرو : ریڈیو گھر گئی ہے

گلاب : (غصّے میں) کہاں ہے وہ تمہارے باپ کا ریڈیو گھر۔

ڈمرو : گالی مت دو یار۔

گلاب : گالی کے بچے نوٹ لا اِدھر۔

پنکھا بند ہو جاتا ہے۔

ڈمرو : (پنکھے کی طرف دیکھ کر) چچ چچ ——— بجلی فیل ہوگئی۔

---

خانہ بدوشوں کا ڈیرا (ڈمرو کا خیمہ ——— بیرونی حصّہ)

ہم کٹ کرکے دکھاتے ہیں کہ رسّی ایک طرف پڑی ہے اور اُسے کھینچنے والا کُتّا بیٹھا ہڈی چبا رہا ہے۔

---

خانہ بدوشوں کا ڈیرا (ڈمرو کا خیمہ ——— اندرونی حصّہ)

ڈمرو : بجلی گھر کا مینجر بڑا حرامی ہے ——— نکال دوں گا سالے کو باہر، آؤ تمہیں ریڈیو سُناؤں۔

گلاب : میں کہتا ہوں میرا نوٹ حوالے کرو میرے۔

ڈمرو : وہ تو ہو گیا ہے غائب اور غائب ہونے کا جو دُکھ مجھے اور تمہیں ہوُا ہے، وہ ریڈیو سُننے سے ہی دُور ہو سکتا ہے۔

ایک طرف لکڑی کا ریڈیو نما بکس پڑا ہے۔ ڈمرو اُس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔

گلاب : تمہارے ریڈیو کی ایسی تیسی۔

ڈمرو : ایسا نہ کہو۔ ناراض ہو جائے گا۔ بٹن گھماتا ہے زور کی کھڑکھڑ ہوتی ہے دیکھا؟ گلاب دیکھتا ہے کہ پنجرے میں یہ آواز طوطا پیدا کر رہا ہے۔

گلاب : یہاں کے جانور بھی چار سو بیس ہیں۔

ڈمرو : (بٹن گھماتا ہے)

طوطا : ہم ساتویں آسمان سے بول رہے ہیں۔

ڈمرو : بالکل ٹھیک ہے ——— لو بھئی سنو گانا۔

باجو پہ موسیقی کی گت شروع ہوتی ہے ——— گلاب طوطے کی طرف دیکھتا ہے

جو خاموش ہے ـــــ گانا شروع ہوتا ہے ـــــ گلاب اِدھر اُدھر
دیکھتا ہے ـــــ ڈمرو اشارے سے گلاب کو بیٹھنے کے لئے کہتا ہے مگر
وہ نہیں بیٹھتا ہے ـــــ تھوڑی دیر کے بعد ڈمرو لکڑی کے ریڈیونما بکس
کے کالے تِرے کو ایک طرف ہٹاتا ہے ـــــ گول دائرے کے پیچھے کٹاری
کا چہرہ نظر آتا ہے ـــــ گلاب کا ردِ عمل ـــــ وہ آگے بڑھتا
ہے کہ لکڑی کے بکس کے پیچھے کٹاری کھڑی ہو جاتی ہے ـــــ گلاب
ذرا اور آگے بڑھتا ہے تو وہ ایک ادا سے گاتی ہوئی گلاب کی بغل میں آ کھڑی
ہوتی ہے۔ گلاب اس کو پکڑنا چاہتا ہے مگر وہ ناچتی ہوئی باہر نکل جاتی ہے۔

---

خانہ بدوشوں کا ڈیرا (ڈمرو کا خیمہ ـــــ بیرونی حصّہ)

گلاب باہر نکلتا ہے ـــــ مرد، عورتیں، لڑکیاں سب جمع ہو جاتی
ہیں ـــــ کٹاری گا اور ناچ رہی ہے ـــــ ایک لمحے کے لئے
گلاب سب کچھ بھول جاتا ہے ـــــ کٹاری کی ادائیں اُسے مسحور کر
دیتی ہیں۔ لیکن تھوڑے وقفے کے بعد اسے اپنا نوٹ یاد آتا ہے ـــــ
ایک دم وہ چلاّتا ہے۔

گلاب : بند کرو یہ بکواس ـــــ میرا نوٹ واپس دو۔

گانا بند ہو جاتا ہے۔ کٹاری پاؤں کے گھنگھرو کھنکھناتی گلاب کے پاس

جاتی ہے۔

کٹاری : نام کیا ہے تمہارا بابو ـــــ

گلاب : (چلا کر) میرا نام ہے سو روپے کا نوٹ

سب زور سے ہنستے ہیں۔

گلاب : بند کرو ہنسی۔

کٹاری : (ایک ادا کے ساتھ) سو روپے کے نوٹ جی ـــــ میرا نام ہے دوقیؔ۔

سب زور سے ہنستے ہیں۔

گلاب : (اور زیادہ چلا کر) میں پاگل ہو جاؤں گا ـــــ میں تم سب کو قتل کر دوں گا۔

---

ڈمرو کی آواز آتی ہے۔

ڈمرو : کون ہے یہ ہٹلر۔

ڈمرو اپنے بازو کے ڈنڑ دکھاتا ہوا قریب قریب گلاب کے اوپر چڑھ جاتا ہے۔

گلاب : تم میرا سو روپیہ کیوں واپس نہیں دیتے ؟

ڈمرو : دیتے ہیں ـــــ اِدھر آؤ (ایک طرف چلتے ہوئے) آؤ۔

گلاب اس کی طرف بڑھتا ہے ـــــ دونوں کچھ دور چلتے ہیں۔

ڈمرو : ایک طرف اشارہ کر کے، کھڑے ہو جاؤ یہاں۔

گلاب وہاں کھڑا ہو جاتا ہے۔

ڈمرو ۔ سو کا نوٹ چاہیئے، ہزار کا۔

گلاب : اپنا سو کا۔

ڈمرو : اپنا سو کا نوٹ ایک —— اپنا سو کا نوٹ دو۔

ایک دم کچھ ہوتا ہے اور گلاب کیمرے پر سے اڑتا ہُوا چلا جاتا ہے —— کٹ کر کے ہم دکھاتے ہیں کہ مینڈھے کی گردن ہل رہی ہے اور گلاب بہت دُور کیچڑ میں لت پت زمین پر اوندھے منہ پڑا ہے —— دانت پیستا ہوُا اُٹھتا ہے۔ چاہتا ہے کہ ڈمرو کی طرف جائے مگر رک جاتا ہے، کیوں کہ ڈمرو کے ساتھ اور کئی ہٹے کٹے مرد آستین چڑھائے کھڑے ہیں۔

گلاب : آج نہیں پھر کبھی سہی —— ایسا مزا چکھاؤں گا کہ یاد رکھو گے — لٹیرے۔ بدمعاش۔

سب خانہ بدوش زور سے ہنستے ہیں —— گلاب ٹرک میں بیٹھتا ہے اور اسے اسٹارٹ کرتا ہے —— اس پر ہنسنے کا شور آتا رہتا ہے۔

---

فیڈ آؤٹ

---

بڑی سرکار کی حویلی (بڑا کمرہ —— اندرونی حصّہ)

تخت پر گاؤ تکیے کا سہارا لیے بڑی سرکار بیٹھا ہے اور ایک دونالی بندوق کا معائنہ کر رہا ہے ـــــ ایک طرف منشی حساب کتاب کر رہا ہے ـــــ دوسری طرف ایک دیہاتی کھڑا ہے ـــــ بڑی سرکار اس سے مخاطب ہوتا ہے۔

بڑی سرکار: اچھی ہے۔

دیہاتی : سرکار نایاب چیز ہے۔

بڑی سرکار: ہمارے لئے کوئی چیز نایاب نہیں ـــــ منشی جی۔

منشی : حضور!

بڑی سرکار: سو کا ایک نوٹ دیجئے اسے۔

دیہاتی : سرکار...... یہ تو بہت کم ہیں ـــــ ایسی نایاب چیز...

بڑی سرکار: نایاب چیز ہے تو نذرانے کے طور پر پیش کرو..... کیوں منشی جی۔

منشی : بالکل درست ہے۔

دیہاتی : لیکن حضور....

منشی : دس کا نوٹ دے کر، لو.....

دیہاتی : میں اسے لایا ہی کیوں؟

بڑی سرکار: کیا کہا؟

منشی : کچھ نہیں حضور ـــــ شکریہ ادا کر رہا ہے۔

دیہاتی : (طنز کے ساتھ) بہت بہت شکریہ حضور!

یہ کہہ کر چلا جاتا ہے ——— بڑی سرکار قہقہے لگاتا ہے اور بندوق

کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتا ہے ——— گلاب داخل ہوتا ہے۔

گلاب : آداب عرض بڑی سرکار۔

بڑی سرکار : آگئے۔

گلاب : جی ہاں۔

بڑی سرکار : میرا مطلب یہ تھا کہ چھوٹی سرکار کا سارا سامان آگیا۔

گلاب : جی ہاں، ایک ایک چیز لے آیا ہوں۔

یہ کہہ کر گلاب اپنے باپ کو روپے دیتا ہے ——— منشی روپے

گنتا ہے۔

گلاب : (آہستہ) ابھی نہیں گنو۔

منشی : کیوں؟

گلاب : آہستہ بولو ——— کم ہیں۔

منشی : (آہستہ) کتنے؟

گلاب : (آہستہ) ایک سو۔

منشی : (اونچی آواز میں) ایک سو!

بڑی سرکار : کیا بات ہے منشی جی!

منشی : حضور....

گلاب : (چُپ رہنے کا اشارہ کرتا ہے)

بڑی سرکار : منشی جی، میں نے پوچھا تھا کیا بات ہے؟

منشی : حضور —— حساب میں ایک سو روپیہ کم ہے۔

بڑی سرکار : ابھی ابھی آپ نے بندوق کی قیمت جو ادا کی ہے۔

منشی : ہاں حضور، وہ تو ہے..... لیکن....

گلاب : (چُپ رہنے کا اشارہ کرتا ہے)

بڑی سرکار گلاب، تم اپنے باپ کو بار بار چُپ رہنے کے لئے کیوں اشارہ کر رہے ہو۔

گلاب : حضور، بات یہ ہے...

منشی : میں عرض کرتا ہوں سرکار —— گلاب کے پاس چھوٹی سرکار کا جو حساب ہے۔ اس میں سو روپئے کم ہیں۔

بڑی سرکار : سو روپئے۔

تخت پر سے بندوق لئے اٹھتا ہے۔

گلاب : جی ہاں۔

بڑی سرکار : کیسے کم ہوئے۔

گلاب : حضور، میں ادھر آ رہا تھا —— راستے میں سڑک پر مجھے ایک

لڑکی ملی۔

بڑی سرکار: لڑکی!

منشی : (اونچی آواز میں) لڑکی؟

گلاب : لڑکی نہیں ——— خانہ بدوش ——— یعنی خانہ بدوش لڑکی۔

بڑی سرکار: خانہ بدوش لڑکی۔

گلاب : (اٹھ کر) جی ہاں ——— وہاں بہت سی ہیں حضور۔

بڑی سرکار: ایک سو؟

گلاب : میں نے گنی نہیں حضور۔ ۔ ۔

بڑی سرکار: سو روپیہ کیسے گم ہوا۔

گلاب : زبردستی چھین کرلے گئی حضور۔

منشی : جھوٹ مت بولو گلاب۔

گلاب : میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔

بڑی سرکار: یعنی ایک لڑکی چھین کرلے گئی تم سے ۔ ۔

گلاب : جی ہاں ——— وہ خانہ بدوش لڑکی ——— کٹاری اس کا نام ہے۔

بڑی سرکار: دل میں تو نہیں کھُب گئی تمہارے۔

گلاب : (خاموش ہوجاتا ہے)

بڑی سرکار: (قہقہہ لگاتا ہے، پھر آواز دیتا ہے) کالو!

دور سے کالو کی آواز آتی ہے "حاضر ہوا سرکار"!

بڑی سرکار: کہاں ہے ان خانہ بدوشوں کا ڈیرہ۔

گلاب : دو ایک کوس دور ہے۔

کالو آتا ہے۔

بڑی سرکار: کالو ــــــــ یہاں سے دو ایک کوس دُور ڈیرہ ہے خانہ بدوشوں کا۔

کالو : جانتا ہوں سرکار۔

بڑی سرکار: ایک لڑکی ہے کٹاری ــــ اس کو حاضر کرو یہاں شام سے پہلے پہلے۔

کالو : ابھی جاتا ہوں سرکار۔

بڑی سرکار: ابھی نہیں ــــ پہلے مینڈھوں کا دانہ پانی دو۔

کالو : چلا سرکار۔

بڑی سرکار: اور شام سے پہلے پہلے کٹاری یہاں موجود ہو۔

کالو : ضرور ہوگی سرکار۔

کالو چلا جاتا ہے۔

بڑی سرکار: منشی جی اگر گلاب کا بیان درست ہے تو ہم اس چھوکری کی کھال اُدھیڑ دیں گے۔

گلاب : (ردِّ عمل)

بڑی سرکار: گولی سے اڑا دیں گے۔

گلاب : (ردِّ عمل)

بڑی سرکار: (بندوق سے کھیلتے ہوئے) اس بندوق کے نشانے کا بھی پتا چل جائے گا۔

گلاب : میرا خیال ہے.....

بڑی سرکار: کیا خیال ہے تمہارا؟

گلاب : میں ہی جاتا ہوں سرکار..... آپ کا نام لوں گا تو وہ ڈر کے ضرور واپس کر دے گی۔ میرا فوٹ ——— میں ابھی جاتا ہوں۔

یہ کہہ کر وہ بڑی تیزی سے باہر نکل جاتا ہے ——— بڑی سرکار قہقہہ لگاتا ہے۔

بڑی سرکار: منشی جی ——— مالک کے دوپٹے سے چھوکریوں کے ساتھ عشق لڑانا ——— یہ ہم ہرگز پسند نہیں کرتے۔

منشی : حضور مجھے یقین تو نہیں کہ گلاب نے ایسا کیا ہے..... لیکن حضور اگر اس نے یہ حرکت کی ہے..... تو آپ مالک ہیں ——— میرے سامنے گردن اڑا دیجئے۔

---

بڑی سرکار کی حویلی ـــــ منشی کا کوارٹر (اندرونی حصّہ)

گلاب ٹرنک اٹھانے میں مصروف ہے ـــــ ایک ٹرنک اٹھاتا ہے ـــــ اس کے بعد دوسرا پھر تیسرا ـــــ سب سے نیچے صندوق ہے۔ پلنگ کے ایک پائے کو اونچا کرتا ہے، اس کے نیچے سے چابی نکالتا ہے۔ صندوق کا تالا کھولتا ہے۔ اس کے اندر سے ایک بکس نکالتا ہے، بکس کی چابی پلنگ کے دوسرے پائے تلے سے نکالتا ہے۔ بٹوہ میں سے ایک اور بٹوہ نکلتا ہے۔ اُسے کھولتا ہے تو کپڑے میں لپٹی ہوئی ایک چیز نکلتی ہے ـــــ اسے کھولتا ہے ـــــ دو نوٹ دکھائی دیتے ہیں سَو سَو کے ـــــ ایک نوٹ نکال کر جیب میں رکھتا ہے اور جلدی جلدی سب چیزیں باری باری بند کرتا ہے ـــــ ٹرنک رکھ رہا ہے کہ اُس کا باپ اندر داخل ہوتا ہے۔

منشی : کیا کر رہے گلاب ؟

گلاب : ایک نوٹ نکالا ہے سو روپے کا۔

منشی : کیوں ؟

گلاب : واپس دوں گا بڑی سرکار کو ـــــ کہوں گا لے آیا ہوں کنّاری سے۔

منشی : (سنگین سنجیدگی کے ساتھ) یہ کنّاری کون ہے گلاب۔

گلاب : میں نہیں جانتا کون ہے ـــــ خانہ بدوش لڑکی ہے ـــــ میں نہیں

چاہتا کہ بڑی سرکار اُس کو سزا دیں۔

منشی : گلاب۔ بیٹھ یہاں۔

گلاب چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے۔

منشی : (بڑی سنجیدگی کے ساتھ) سُن ——— تو ایک غریب آدمی کا لڑکا ہے۔ عیاشیاں صرف امیروں کے لئے ہیں ——— تو کہیں بہک تو نہیں گیا۔

گلاب : میں سمجھا نہیں۔

منشی : تو مجھے صرف اتنا کہہ دے کہ تیرا من میلا نہیں بس!

گلاب : میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میرا من چھوٹی سرکار کا من نہیں ۔۔۔

منشی : بس بس! ——— جا لے جا روپے۔

گلاب اٹھتا ہے۔

منشی : ٹھہر (مسکراتا ہے) اتنی جلدی جا رہا ہے ——— بڑی سرکار یہ نہ پوچھیں گے کہ دو کوس کا آنا جانا تو نے اتنی جلدی کیسے کیا؟

گلاب : (مسکراتا ہے) یہ میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔

منشی : بیٹھ جا تھوڑی دیر یہاں۔

دونوں چارپائی پر بیٹھ جاتے ہیں ——— منشی گلاب کے کاندھے پر ہاتھ رکھتا ہے، بڑے پیار سے۔

منشی : بس میری یہ دعا ہے کہ تو سدا نیک رہے۔

گلاب مسکراتا ہے۔

---

بڑی سرکار کی حویلی (بڑا کمرہ)

ہم ڈزالو کرتے ہیں ـــــــ بڑی سرکار ہاتھ پر باز رکھے اُس سے کھیل رہا ہے۔ گلاب داخل ہوتا ہے۔ بڑی سرکار اُس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

بڑی سرکار : (ذو معنی لہجے میں) کٹاری سے مل آئے؟

گلاب : جی ہاں۔

بڑی سرکار : اور زیادہ گھائل تو نہیں ہوئے؟

گلاب : جی!

بڑی سرکار : (قہقہہ لگاتا ہے) روپے دئے واپس؟

گلاب : جی ہاں۔

یہ کہہ کر وہ سو روپے کا نوٹ جیب سے نکالتا ہے۔

گلاب : دیتی نہیں تھی، پر جب میں نے کہا کہ بڑی سرکار مارے کوڑوں کے کھال اُدھیڑ دیں گے تو جھٹ سے نوٹ میرے حوالے کیا۔

کٹاری کی آواز آتی ہے۔

کٹاری : جھوٹ!

بڑی سرکار اور گلاب کا ردِ عمل ——— گلاب بالکل بوکھلا جاتا ہے۔

کٹاری تھرکتی ، ناچتی گلاب کے پاس آتی ہے۔

کالو : حضور، کٹاری حاضر ہے۔

بڑی سرکار: (کٹاری کی طرف غور سے دیکھتا ہے) کافی تیز ہے (گلاب سے) گلاب، نوٹ

کیسے واپس کئے اس نے؟

کٹاری : (کس نے واپس کئے؟ (گلاب سے) جھوٹے۔

بڑی سرکار : بات کیا ہے گلاب؟

گلاب : (سر جھکا کر) حضور، آپ نے کہا تھا آپ کھال ادھیڑ دیں گے اس کی ....

کٹاری : میری کھال ادھیڑ دیں گے؟

گلاب : یہ نوٹ میرا اپنا ہے۔

بڑی سرکار: تو اس کا یہ مطلب ہے کہ کٹاری چل گئی ہے تمہارے دل پر (ہنستا ہے)

گلاب : (خاموش رہتا ہے)

کٹاری : (بڑی سرکار سے) جناب آپ مجھ سے بات کیجئے ——— (کالو کی طرف اشارہ

کرکے) اس کالے آدمی کو بھیج کر مجھے کیوں بلایا گیا ہے یہاں۔

کالو : حضور اس کی زبان بند کیجئے۔

کٹاری : اپنی جیب نکال کر کالو کو دکھاتی ہے۔

بڑی سرکار: گلاب، چھوٹی سرکار کو بلاؤ۔

کٹاری : تم چھوٹی موٹی جتنی چاہے سرکاریں بلالو ——— میں سو روپیہ واپس نہیں دینے کی۔

گلاب چلا جاتا ہے۔

بڑی سرکار: (باز سے کھیلتے ہوئے) کیوں۔

کٹاری : اجی واہ ——— شرط جیتی ہے جناب۔

بڑی سرکار: کیسی شرط؟

کٹاری : میری کلائی پکڑلی، میں نے چھڑالی ——— اور سو روپیہ جیت لیا ——— اب آپ ہی بتایئے جناب!، یہ روپیہ کیسے واپس ہو سکتا ہے۔

بڑی سرکار: تم ایک جگہ کھڑی کیوں نہیں رہتیں؟

کٹاری : (مسکرا کر) چلت پھرت ہم خانہ بدوشوں کی زندگی ہے۔

چھوٹی سرکار داخل ہوتا ہے، کٹاری کی طرف نہیں دیکھتا۔

چھوٹی سرکار: آپ نے مجھے بلایا ہے۔

بڑی سرکار: (کٹاری کی طرف اشارہ کرکے) یہ چیز دیکھنے کے لئے۔

چھوٹی سرکار کٹاری کی طرف دیکھتا ہے ——— کٹاری مسکراتی ہے اور اس کی طرف بڑھتی ہے۔

کٹاری : آپ کیا شے ہیں جناب؟

بڑی سرکار ہنستا ہے۔

چھوٹی سرکار: کون ہے یہ لڑکی ؟

بڑی سرکار: کٹاری! —— کلائی پکڑو اس کی۔

کٹاری : نہ نہ نہ نہ —— کٹ جائیں گے ہاتھ۔

بڑی سرکار: کیوں کٹاری، پکڑے چھوٹی سرکار تمہاری کلائی ؟

کٹاری : شرط ہوگی سو روپے کے ساتھ۔

بڑی سرکار: منظور۔

کٹاری : لاؤ ہاتھ۔

کٹاری بڑی سرکار کے ہاتھ پر ہاتھ مارتی ہے اور آستین چڑھا کر اپنی کلائی چھوٹی سرکار کی طرف بڑھاتی ہے۔

کٹاری : لو۔

بڑی سرکار: چلو بھئی پکڑو ——

چھوٹی سرکار: میں کچھ سمجھا نہیں۔

کٹاری : تم پکڑو کلائی، میں سمجھاتی ہوں۔

چھوٹی سرکار کلائی پکڑتا ہے۔

کٹاری : مضبوط پکڑو —— لو میں لگی ہوں چھڑانے۔

چھوٹی سرکار ایک دم گرفت مضبوط کر دیتا ہے —— کٹاری زور سے

"اوئی" کرتی ہے اور چھوٹی سرکار کے ہاتھ کو جھٹکا دیتی ہے۔ مگر وہ گرفت کو اور زیادہ مضبوط کر دیتا ہے۔ اب کٹاری زور لگانا شروع کر دیتی ہے۔

مگر چھوٹی سرکار کلائی نہیں چھوڑتا —— بڑی سرکار قہقہے لگاتا ہے۔

بڑی سرکار : (چھوٹی سرکار سے) چھوڑ دو کلائی۔

چھوٹی سرکار کلائی چھوڑ دیتا ہے۔

بڑی سرکار : کٹاری تم ہار گئیں ہمارے بیٹے سے۔

کٹاری : ہار کیسے گئی ..... (کلائی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) جب میں نے اوئی کیا تھا تو اُس نے ہاتھ ڈھیلے کیوں نہ کیے —— یہ بھی کوئی بات ہے (چھوٹی سرکار سے) سنگدل کہیں کا۔

چھوٹی سرکار مسکراتا ہے —— بڑی سرکار قہقہہ لگاتا ہے اور چھوٹی سرکار سے مخاطب ہوتا ہے۔

بڑی سرکار : ہم جاتے ہیں تم شرط کے روپے وصول کر لو اس سے —— چلو کالو۔

یہ کہہ کر بڑی سرکار باز کو پیار کرتا ہوا کالو کو ساتھ لے کر چلا جاتا ہے۔

کٹاری اپنے پیروں کے جانجھ بجاتی ہے۔

کٹاری : کیوں جناب —— روپے وصول کرو گے مجھ سے؟

چھوٹی سرکار : (کٹاری کا ہاتھ پکڑنا چاہتا ہے مگر وہ تڑپ کر ایک طرف ہٹ جاتی ہے۔

کٹاری : نہ نہ نہ نہ —— ہاتھ مت لگانا مجھے۔

چھوٹی سرکار: کٹاری سنو ـــــ کہاں رہتی ہو تم؟

کٹاری : زمین کے اوپر ـــــ آسمان کے نیچے۔

چھوٹی سرکار: تمہارا گھر کہاں ہے؟

کٹاری : کندھوں پر۔

چھوٹی سرکار: اوہ ..... اوہ ـــــ میں سمجھا .... (پاس جاکر آہستہ سے)

کل آؤ گی؟

کٹاری : کیا دو گے مجھے؟

چھوٹی سرکار: جو تم مانگو گی۔

کٹاری : واہ میرے راجہ ..... پیروں کے لئے گرگابی ... کانوں کے لئے

بُندے ..... ٹس لس کرتے ریشمی لہنگے ....

چھوٹی سرکار: سلمے ستارے کے دوپٹے۔

کٹاری : نہیں جی نہیں ـــــ دوپٹے نہیں چاہئیں مجھے ـــــ ریشمی رومال۔

چھوٹی سرکار کٹاری کی طرف بڑھتا ہے اور اُسے پکڑنا چاہتا ہے۔

چھوٹی سرکار: (آہستہ) تم کل آنا ـــــ میں سب کچھ لادوں گا۔

کٹاری : لادو گے ـــــ پر تم چوروں کی طرح کیوں باتیں کرتے ہو۔

چھوٹی سرکار اُسے پکڑنا چاہتا ہے مگر وہ تڑپ کر ایک طرف ہو جاتی ہے۔

کٹاری : نہ نہ نہ نہ ـــــ ہاتھ مت لگانا مجھے۔ (ہنستی ہے) اچھا تو میں چلی۔

(چھوٹی سرکار کے کان میں)، کل آؤں گی۔

یہ کہہ کر کٹاری تھرکتی ہوئی کمرے سے باہر نکل جاتی ہے۔

---

بڑی سرکار کی حویلی (باغ)

چمیلی گلاب کے پھول توڑ رہی ہے ——— کٹاری تھرکتی ہوئی آتی ہے

اور پھول چمیلی سے چھین کر اپنے بالوں میں لگا لیتی ہے۔ چمیلی اس

پر جھپٹتی ہے۔

چمیلی : کون ہے تو؟ ——— پھول لا ادھر۔

کٹاری : مسکراتی ہے اور دو تین پھول چمیلی کے ہاتھ سے چھین لیتی ہے۔

دونوں ایک دوسری سے اُلجھ جاتی ہیں۔ اتنے میں چھوٹی سرکار آ

جاتا ہے۔

چھوٹی سرکار: چمیلی۔

چمیلی ایک طرف ہٹ جاتی ہے ——— کٹاری مسکراتی ہے اور سارے

پھول جو کہ چمیلی کے ہاتھ سے گر گئے تھے اٹھا لیتی ہے۔

چمیلی : کون ہے یہ چھوٹی سرکار۔

کٹاری : اس باغ کی مالک ——— (چھوٹی سرکار سے) کیوں؟

مسکراتی ہے اور پتے نوچ کر چمیلی کے منہ پر پھینک کر تھرکتی ہوئی چلی

جاتی ہے۔

---

بڑی سرکار کی حویلی دگیٹ کے باہر)

کٹاری تھرکتی ہوئی باہر نکلتی ہے ـــــــ گلاب ایک طرف کھڑا ہے،

اُسے دیکھ کر رُک جاتی ہے۔ پھر مسکرا کر اس کے پاس جاتی ہے۔

کٹاری : تم یہاں کھڑے ہو۔

گلاب : ہاں۔

کٹاری : آدمی اچھے ہو تم ...... مجھے بچانے کے لئے جھوٹ بولنا پڑا تمہیں۔

گلاب : بڑی سرکار نے تم سے کیا کہا۔

کٹاری : کچھ نہیں ـــــ کہا جاؤ عیش کرو تم ـــــ (ایک دم) میں نے کہا تمہارا

نام کیا ہے ـــــ میں بھُول گئی ہوں۔

گلاب : میرا نام گلاب ہے۔

کٹاری : (گلاب کا ایک پھول گھما کر سونگھتے ہوئے) ایسی خوشبو ہے تم میں ؟

گلاب : (خاموش رہتا ہے)

کٹاری گلاب کے کُرتے کے بٹن ہول میں گلاب کا پھول لگا دیتی ہے۔

کٹاری : کبھی آنا ہمارے ڈیرے۔

یہ کہہ کر وہ چند قدم چلتی ہے، مُڑتی ہے اور ایک ادا کے ساتھ ایک پھول

گلاب کی طرف پھینکتی ہے ۔ گلاب اُسے دبوچ لیتا ہے —— چھوٹی سرکار کی آواز آتی ہے ۔

چھوٹی سرکار: یہ بات ہے !

گلاب کا ردِ عمل —— چھوٹی سرکار آتا ہے ۔ گلاب اپنے بٹن ہول سے پھول نکال لیتا ہے اور ایک طرف چلا جاتا ہے ۔

چھوٹی سرکار: (مسکراتا ہے) پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں —— یہ مت بھولنا گلاب (ہنستا ہے)

---

فیڈ آوٹ

---

خانہ بدوشوں کا ڈیرا (رات کا وقت)

ایک چبوترے پر پھل، مٹھائیاں اور کھانے کا سامان پڑا ہے —— اس کے ارد گرد گھیرا باندھے خانہ بدوش لڑکیاں، عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے کھڑے ہیں —— ڈمرو آتا ہے اور چاروں طرف دیکھتا ہے ۔

ڈمرو : سب اکٹھے ہوگئے (بلند آواز میں) —— بولو سو روپے کا نوٹ ۔

سب : زندہ باد ۔

ڈمرو : سو روپے کا نوٹ۔

سب : زندہ باد۔

ڈمرو : ایک ——— دو .....

سب چبوترے پر پل پڑتے ہیں ——— ایک شور برپا ہوتا ہے ——— ایک سیکنڈ کے عرصہ میں سب چیزیں صاف ہو جاتی ہیں ——— خاموشی چھا جاتی ہے ——— ڈمرو ایک طرف بیٹھ کر بڑے اطمینان سے اپنے تہمد کا ڈب کھولتا ہے اور ایک گھڑی نکالتا ہے، اس کی سوئیاں ہی نہیں، وقت دیکھتا ہے۔

ڈمرو : وقت ہو گیا ہے میرے گانے کا۔

یہ کہہ کر وہ گھڑی ڈب میں رکھتا ہے اور پاس پڑا ہوا بکس کھولتا ہے۔ اس میں سے وہ بانجو نکالتا ہے، جس کے تار ہی نہیں۔ گستا ہے تار جو نہیں ہیں انہیں بجاتا ہے ——— آواز آتی ہے ——— مطمئن ہو کر آسن جما کر بیٹھتا ہے اور باقاعدہ بجانا شروع کرتا ہے ——— کیمرہ پیچھے ہٹتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ کٹاری بانجو بجا رہی ہے ——— ڈمرو گانا شروع کرتا ہے ——— الفاظ بالکل بے معنی ہیں لیکن وہ انہیں اس طرح ادا کرتا ہے جیسے وہ ان کے معنی جانتا ہے۔ اس دوران میں گلاب داخل ہوتا ہے ——— کٹاری گلاب کو دیکھتی ہے تو مسکراتی ہے ———

بے معنی گانا کورس میں تبدیل ہو جاتا ہے ـــــ دفعتہً کٹاری بانجو لئے اٹھتی ہے اور رقص شروع کر دیتی ہے۔ کورس بند ہو جاتا ہے ـــــ کٹاری سولو گانا شروع کرتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ رقص کرتی ہے۔ توجہ کا مرکز گلاب ہے جو بے چینی محسوس کرتا ہے ـــــ کٹاری یہ دیکھتی ہے تو گانا بند کر دیتی ہے اور گلاب کو کھینچ کر ایک طرف لے جاتی ہے۔

---

خانہ بدوشوں کا ڈیرا (جھرنا)

گلاب کا ہاتھ پکڑے کٹاری آتی ہے اور جھرنے اور اس کے آس پاس کی فضا کو پیار کی نظر سے دیکھتی ہے۔

کٹاری : کتنی خوبصورت جگہ ہے ـــــ میں رات کو یہاں نہایا کرتی ہوں۔

یہ کہہ کر وہ اپنا لہنگا اونچا کرتی ہے اور پانی میں جاتی ہے۔

کٹاری : بہت ٹھنڈا ہے پانی ....

یہ کہہ کر وہ بڑے پتھر پہ بیٹھ جاتی ہے۔

کٹاری : آؤ گلاب بیٹھو۔

گلاب اس کے پاس بیٹھ جاتا ہے، کسی قدر جھینپتے ہوئے۔

کٹاری : تم اتنے شرمیلے کیوں ہو؟

گلاب : تم آزاد ہو اور میں نے اپنی ساری زندگی غلامی میں گزاری ہے۔

کٹاری : کس کی غلامی میں۔

گلاب : جن کے پاس نوکر ہوں۔

کٹاری : چھوڑ دو نوکری۔

گلاب : کھاؤں گا کہاں سے؟

کٹاری : کھاؤ کے کہاں سے؟ (بے تحاشا ہنسنا شروع کر دیتی ہے —— پھر ایکدم سنجیدہ ہو کر) میری عمر کیا ہو گی؟

گلاب : یہی کوئی .....

کٹاری : اٹھارہ سال کی ہوں —— تم قسم لے لو مجھ سے جو میں نے ایک دن بھی سوچا ہو کہ کھاؤں گی کہاں سے —— میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ کھانا جانتی ہوں۔ (ایک دم لہنگے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک ناشپاتی نکالتی ہے) لو کھاؤ۔

گلاب کے ہاتھ پر ناشپاتی رکھتی ہے تو اس میں پھول دکھائی دیتے ہیں۔

کٹاری : یہ کیا؟

گلاب : تمہارے دیئے ہوئے پھول۔

کٹاری : پھینکو ان کو میں تمہیں اور دوں گی۔

پھول پانی میں پھینک دیتی ہے —— گلاب اٹھا لیتا ہے اور بڑی سنجیدگی سے کٹاری سے گفتگو شروع کر دیتا ہے۔

گلاب : کٹاری۔

کٹاری : کیا؟

گلاب : یہ پھول تم نے مجھے کیوں دیئے تھے۔

کٹاری کیوں دیئے تھے (پانی میں کود جاتی ہے، ہائے بڑا ٹھنڈا پانی ہے۔

گلاب کٹاری کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔

گلاب : کٹاری۔

کٹاری : (ادا کے ساتھ) کیا ہے؟

گلاب : یہ پھول تم نے مجھے کیوں دیئے تھے۔

کٹاری : پانی بہت ٹھنڈا ہے۔

گلاب چڑ کر پانی میں پھول دے مارتا ہے۔

کٹاری : (ہنستی ہے اور پھول اٹھاتی ہے) پانی اتنا ٹھنڈا ہے کہ ——— دیکھو پھول بھی ٹھنڈے ہو گئے۔

گلاب چل پڑتا ہے۔

کٹاری : بس اتنی بات پر ناراض ہو گئے . . . سو روپے کے نوٹ جی، میں نے پھول اس لئے دیئے تھے۔

گلاب جواب کا متوقع ہے ——— کٹاری چپ ہو جاتی ہے تو اُسے کوفت ہوتی ہے۔

کٹاری : (ہنستی ہے) میں نے پھول اِس لیے دیئے تھے کہ تم اس قابل تھے کہ تمہیں
پھول دیئے جائیں۔

گلاب کٹاری کا ہاتھ پکڑ کر پیار سے دباتا ہے۔

کٹاری : تم خود بھی تو ایک پھول ہو۔

(ایک دم سنجیدگی کے ساتھ) کٹاری۔

کٹاری : (آنکھیں مٹکا کر) کیا؟

گلاب : مجھے معلوم نہیں تم نے جھوٹ کہا ہے یا سچ لیکن میں . . . . لیکن میں تم
سے محبت کرتا ہوں۔

کٹاری : (شرارت سے) پانی بہت ٹھنڈا ہے۔

گلاب ہنس پڑتا ہے۔ کٹاری بھی ہنسنا شروع کر دیتی ہے۔ گلاب اسے پکڑ لیتا ہے —— قریب ہے کہ گلاب اُسے اپنے سینے کے ساتھ لگالے کہ "چخ چخ" کی آواز آتی ہے —— گلاب کا ردِّ عمل —— بیگم بندریا ہاتھ میں سگرٹ اور ماچس لیے داخل ہوتی ہے —— کٹاری اُس سے سگرٹ اور ماچس لے لیتی ہے۔

کٹاری : میں رات کو نہانے کے بعد ایک سگرٹ پیا کرتی ہوں۔

بندریا کو اٹھا کر اپنے کندھے پر بٹھا لیتی ہے۔

کٹاری : گلاب تم اب جاؤ —— مجھے نہانا ہے —— کل آؤں گی تم

سے ملنے۔

گلاب : لیکن!

کٹاری : (شرارت کے ساتھ) پانی بہت ٹھنڈا ہے۔

دونوں ہنستے ہیں۔

---

فیڈ آؤٹ

---

بڑی سرکار کی حویلی (چھوٹی سرکار کا کمرہ)

ہم فیڈ اِن کرتے ہیں۔

چمیلی ریڈیو صاف کر رہی ہے۔ صاف کرنے کے بعد وہ اِسے اُون کرتی ہے اور ایک اسٹیشن لگاتی ہے ——

سازوں پر کوئی گت بج رہی ہے۔ اس کی تال پر چمیلی ناچنا شروع کر دیتی ہے۔ ناچتی ناچتی وہ سنگار میز کے پاس جاتی ہے —— آئینے میں اپنے بال سنوارتی ہے —— پھر ناچتی ہوئی تپائی کے پاس جاتی ہے۔ جہاں رسالے پڑے ہیں —— ایک رسالہ اٹھاتی ہے، اس کے سرورق پر نیم برہنہ تصویر ہے۔ ایک دم اُسے الٹا کر کے تپائی پر رکھتی ہے —— پھر مسکرا کر اُسے اٹھاتی ہے اور تصویر کو غور سے دیکھتی ہے —— تصویر

دیکھتی دیکھتی کھڑکی کی طرف بڑھتی ہے ——— ایک دم موٹر سائیکل کی
پھٹ پھٹ سُنائی دیتی ہے ——— چمیلی چھپ کر کھڑکی میں سے باہر
جھانکتی ہے ——— گیراج کا ٹاٹ کا پردہ ہل رہا ہے ——— تھوڑے
توقف کے بعد چھوٹی سرکار بغل میں کچھ چیزیں دبائے باہر نکلتا ہے۔

---

بڑی سرکار کی حویلی (باغ)

ہم کٹ کر کے باغ میں آتے ہیں۔

مالی کیاریاں ٹھیک کر رہا ہے ——— چھوٹی سرکار اُس کے
پاس آتا ہے۔

چھوٹی سرکار: مالی۔

مالی : حضور!

چھوٹی سرکار: گلاب کہاں ہے؟

مالی : (اٹھ کر) دیکھتا ہوں حضور۔

چھوٹی سرکار: (بوٹ کا کھلا ہوا ڈبہ دکھا کر) گرگابی کا ایک پیر راستے میں گر گیا ہے ———
اُس سے کہو جلدی تلاش کر کے لائے (گرگابی کا دوسرا پیر دکھا کر) اس
کے ساتھ کا۔

مالی : (گرگابی کے پیر کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر) بہت اچھا حضور۔

چھوٹی سرکار: ایک دم جلدی ـــــ کہنا سائیکل ہے جائے میری۔

یہ کہہ کر وہ سامنے دیکھتا ہے ـــــ پلٹتا ہے تو مالی مسکرا رہا ہے ـــــ لیکن وہ فوراً ہی مسکرانا بند کر دیتا ہے۔

---

بڑی سرکار کی حویلی (چھوٹی سرکار کا کمرہ)

چمیلی کھڑکی سے ہٹ کر جلدی جلدی ریڈیو بند کر دیتی ہے ـــــ ایسا کرتے ہوئے وہ رسالہ اپنی بغل میں دبا لیتی ہے ـــــ چھوٹی سرکار داخل ہوتا ہے ـــــ چمیلی کا ردِ عمل ـــــ اس کی بغل میں سے رسالہ گر پڑتا ہے ـــــ دوہرا ردِ عمل ـــــ چھوٹی سرکار اُس کے پاس آتا ہے ـــــ رسالہ زمین پر دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے۔ چمیلی جھینپ جاتی ہے ـــــ چھوٹی سرکار رسالہ اٹھانے کے لئے جھکتا ہے تو اس کی بغل میں سے بنڈل کھل کر گر پڑتا ہے ـــــ ایک دو لہنگے ہیں، کچھ ریشمی رومال اور اسی قسم کی کچھ اور چیزیں۔

چھوٹی سرکار: اٹھاؤ انہیں۔

چمیلی یہ چیزیں اٹھاتی ہے اور ہر ایک کو غور سے دیکھتی ہے۔

چمیلی : کس کے لئے لائے ہیں چھوٹی سرکار۔

چھوٹی سرکار: (رسالے کی تصویریں دیکھتے ہوئے) بوجھو۔

چمیلی : میں کیا جانوں۔

چھوٹی سرکار : دیکھو پلنگ پر بتاتا ہوں۔

چمیلی اُٹھ کر چیزیں پلنگ پر رکھتی ہے ——— چھوٹی سرکار آگے بڑھ کر چمیلی کو پکڑتا ہے۔

چھوٹی سرکار : بیٹھو اِدھر۔

چھوٹی سرکار چمیلی کو اپنے ساتھ پلنگ پر بٹھاتا ہے۔

چھوٹی سرکار : تم اس روز بھاگ کیوں گئی تھیں ؟

چمیلی : (شرماکر) معلوم نہیں۔

چھوٹی سرکار : معلوم نہیں ؟ ——— تمہیں سب کچھ معلوم ہے ——— یہ معلوم نہیں تمہیں کہ ہم تم سے پیار کرتے ہیں۔

چمیلی کا ہاتھ پکڑتا ہے۔

چمیلی : (پلنگ پر چیزیں دیکھ کر) یہ کس کے لیے لائے ہیں آپ ؟

چھوٹی سرکار : تمہارے لئے۔

چمیلی : میرے لئے۔

یہ کہہ کر چمیلی ریشمی لہنگے پر ہاتھ پھیرتی ہے ——— چھوٹی سرکار چمیلی کے منہ پر ہولے سے طمانچہ مار کر اٹھتا ہے۔ اور دروازے کی طرف بڑھتا ہے دروازہ بند کرنا چاہتا ہے کہ چمیلی دیوانہ وار آتی ہے۔

چمیلی : نہیں ——— نہیں ——— چھوٹی سرکار نہیں۔

چھوٹی سرکار: (چمیلی کو پکڑ) تم کیسی ہو ——— نہ اِدھر نہ اُدھر۔

چمیلی : (توقف کے بعد سنبھل کر) معلوم نہیں مجھے کیا ہو جاتا ہے۔

چھوٹی سرکار: پگلی۔

یہ کہہ کر دروازہ بند کرنے لگتا ہے کہ باہر سے زور کی چیخ سنائی دیتی ہے ——— چھوٹی سرکار تیزی سے کھڑکی کی طرف بڑھتا ہے۔

---

بڑی سرکار کی حویلی دگیٹ)

گیٹ کی پرلی طرف کٹاری کھڑی ہے، ادھر مالی ہے۔

کٹاری : دیکھو، میں اور زیادہ زور سے چیخوں گی ——— کھول دو دروازہ۔

مالی : میں کہہ چکا ہوں چھوٹی سرکار باہر ہیں۔

کٹاری : (زور سے چیختی ہے)

ہم کٹ کر کے دکھاتے ہیں کہ باغ میں گلاب یہ چیخ سُنتا ہے اور دوڑتا ہے۔

کٹاری : لو وہ گلاب آگیا ——— گلاب!

گلاب آتا ہے۔

گلاب : کٹاری ——— آؤ آؤ۔

گلاب دروازہ کھولتا ہے۔ کٹاری اندر آتی ہے اور مالی جیب نکال کر

دکھاتی ہے۔

کنتاری : یہ مالی کا بچہ مجھے اندر نہیں آنے دیتا تھا۔

گلاب : (مسکراتا ہے) آؤ۔

دونوں بڑھنے لگتے ہیں کہ مالی گلاب سے مخاطب ہوتا ہے۔

مالی : گلاب!

گلاب : کیا؟

مالی : چھوٹی سرکار راستے میں زنانہ گرگابی کا پیر گرا آئے ہیں۔

گلاب : زنانہ گرگابی کا پیر۔

مالی : کہا ہے کہ تم فوراً موٹر سائیکل لے کر جاؤ اور تلاش کرو۔

گلاب : میں کہاں ڈھونڈتا پھروں گا۔

مالی : جو حکم ہے میں نے تمہیں سنا دیا ہے۔

گلاب : حکم ——— ہاں ——— جاتا ہوں ——— (کنتاری سے) میں ابھی آتا ہوں۔

گلاب چلا جاتا ہے ——— کنتاری ٹہلتے ٹہلتے اپنے سامنے دیکھتی ہے۔

---

بڑی سرکار کی حویلی (چھوٹی سرکار کا کمرہ)

ہم کٹ کر کے کھڑکی پر آتے ہیں۔

چھوٹی سرکار کھڑکی سے ہٹتا ہے اور چمیلی سے جو اس کے پاس کھڑی ہے مخاطب۔

چھوٹی سرکار: چمیلی، اب تم جاؤ۔

چمیلی : کھڑکی سے باہر دیکھتی ہے)، جاؤں!

چھوٹی سرکار: ہاں، پھر آنا۔

چمیلی : یہ کون لڑکی ہے؟

چھوٹی سرکار: کون؟

چمیلی : یہی ——— جس نے مجھ سے پھول چھینے تھے۔

چھوٹی سرکار: ہاں ہاں وہ . . . . اب تم جاؤ۔

چمیلی : میں نہیں جاؤں گی۔

موٹر سائیکل کی پھٹ پھٹ سنائی دیتی ہے۔

چھوٹی سرکار: گلاب گیا ——— (تھوڑے توقف کے بعد) جاؤ چمیلی۔ کوئی آ جائے گا۔

کٹاری کی آواز آتی ہے۔

کٹاری : میرے سوا کوئی نہیں آ سکتا۔

چمیلی اور چھوٹی سرکار کا ردِ عمل ——— کٹاری ادائیں بکھیرتی چھوٹی سرکار کے پاس آتی ہے۔

کٹاری : آداب عرض کرتی ہوں، چھوٹی سرکار۔ (چمیلی کی طرف دیکھ کر جیب نکالتی ہے۔

چھوٹی سرکار: چمیلی جاؤ۔

چمیلی ایک لمحے کے لئے کھڑی رہتی ہے، اس کے بعد جلی بھنی باہر جاتی

ہے ——— چھوٹی سرکار دروازہ بند کرکے اندر سے چٹخنی چڑھاتا

ہے ——— کٹاری کا ردِ عمل۔

کٹاری : دروازہ کیوں بند کرتے ہو؟

چھوٹی سرکار: (مسکراکر) کوئی آنہ جائے۔

کٹاری : اور جو کوئی چلائے۔

چھوٹی سرکار: کیا؟

کٹاری : کچھ نہیں (ہنستی ہے اور تھرکتی ہوئی پلنگ کی طرف جاتی ہے ———

(چیزیں دیکھ کر) ارے واہ تم وعدے کے پکے نکلے۔ (چیزیں اٹھا اٹھا کر

دیکھتی ہے)

چھوٹی سرکار اس کے پاس آتا ہے۔

کٹاری : (ایک دم چھوٹی سرکار سے) تم اندھے تو نہیں ؟

چھوٹی سرکار: (حیرت سے) کیوں ؟

کٹاری : (اپنے پاؤں دکھاکر) میرے دو پاؤں ہیں دگرگابی اٹھاکر) اور یہ ایک ہے۔

چھوٹی سرکار: (ہنستا ہے) ایک پیر گر گیا راستے میں۔

کٹاری : اوہ !

چھوٹی سرکار: (پیار سے) آؤ بیٹھو۔

کٹاری : نہیں جناب ——— مجھ سے نہیں بیٹھا جاتا۔ (پلنگ پر سے چیزیں اٹھاتی ہے)

چھوٹی سرکار: (کٹاری کا بازو پکڑ کر) بیٹھ بھی جاؤ۔

کٹاری : نہ نہ نہ ——— ہاتھ مت لگاؤ مجھے ——— کٹ جائے گا۔

تڑپ کر ایک طرف ہو جاتی ہے ——— چھوٹی سرکار اٹھتا ہے اور اُسے پکڑنا چاہتا ہے۔ کٹاری ملحقہ کمرے میں دوڑ جاتی ہے ——— چھوٹی سرکار مطمئن ہو کر کمرے کی طرف بڑھتا ہے ——— کھٹ سے دروازے کے پٹ بند ہو جاتے ہیں۔ چھوٹی سرکار دستک دیتا ہے۔

چھوٹی سرکار: کٹاری ——— کٹاری۔

کٹاری : (اندر سے آواز آتی ہے) ٹھہرو ——— میں کپڑے بدل رہی ہوں۔

چھوٹی سرکار اضطراب میں ٹہلنا شروع کر دیتا ہے ——— دروازہ کھلتا ہے ——— کٹاری جھانکتی ہے۔

کٹاری : بابو۔

چھوٹی سرکار متوجہ ہوتا ہے۔

کٹاری : ازار بند ڈالنا ہے، کوئی چیز دو۔

چھوٹی سرکار میز پر سے "پرونی" اٹھا کر کٹاری کے ہاتھ میں دیتا ہے اور ساتھ ہی ہاتھ پکڑ لیتا ہے ——— کٹاری دانتوں سے کاٹتی ہے اور دروازہ بند

کر دیتی ہے ——— چھوٹی سرکار ہاتھ سہلاتا رہ جاتا ہے ——— بھنایا ہُوا ٹہلنا شروع کر دیتا ہے ——— ریڈیو کے پاس جاتا ہے او اون کر کے کوئی اسٹیشن لگاتا ہے۔ ڈانس کی دُھن شروع ہوتی ہے ——— چھوٹی سرکار پرچہ اٹھاتا ہے جس کے سرورق پر نیم برہنہ تصویر چھپی ہے اور کمرے کی طرف دیکھتا ہے۔ دروازہ کھلتا ہے۔ کٹاری نئے کپڑوں میں، ایک پاؤں میں گرگابی پہنے ریڈیائی موسیقی کی تال پر ناچتی کمرے میں آتی ہے ——— پرانے کپڑے ایک طرف پھینک دیتی ہے ——— چھوٹی سرکار کی طرف بڑھتی ہے۔ رسالے پر ایک نظر ڈالتی ہے اور چھین کر پھینک دیتی ہے۔

کٹاری: چھی ——— چھی ——— چھی۔

چھوٹی سرکار: آؤ بیٹھو۔

کٹاری: نہیں جناب ——— مجھ سے بیٹھا نہیں جاتا ——— تم مجھے یہ بتاؤ روپیہ پیسہ کہاں رکھتے ہو؟

چھوٹی سرکار: اوہ ——— ادھر آؤ۔

چھوٹی سرکار میز کا دروازہ کھولتا ہے ——— اس میں بہت سے نوٹ دکھائی دیتے ہیں ——— کٹاری جیب سے پانسے نکالتی ہے اور انہیں ہاتھ میں ہلاتی ہے۔

کٹاری : کہو، چھ تین نو پھینکوں۔

چھوٹی سرکار: چھ تین تم پھینک چکیں۔

کٹاری : لگاؤ شرط۔

چھوٹی سرکار: لگاؤ۔

کٹاری : سو سو روپئے۔

چھوٹی سرکار: رہے۔

کٹاری : لو۔ ۔ ۔ ۔ (پانسے پھینکتی ہے) یہ لو چھ تین نو۔

چھ تین نو آجاتے ہیں ——— کٹاری جھٹ سے دراز میں سے سو روپے کا نوٹ اٹھاتی ہے ——— چھوٹی سرکار پانسے اٹھاکر دیکھتا ہے۔ ایک پر تین ہی تین ہیں اور دوسرے پر چھ ہی چھ۔

چھوٹی سرکار: ٹھہرو۔ (پکڑنا چاہتا ہے)

کٹاری بھاگتی ہے، دروازہ کھول کر باہر نکل جاتی ہے۔ چھوٹی سرکار تعاقب کرتا ہے مگر کٹاری دروازہ بند کر دیتی ہے ——— چھوٹی سرکار بھنا جاتا ہے۔

چھوٹی سرکار: کٹاری ——— کٹاری۔

کٹاری دروازہ نہیں کھولتی ——— چھوٹی سرکار مختلف چیزوں کو ٹھوکریں مارتا ریڈیو کے پاس آتا ہے ——— بٹن گھماتا ہے تو موسیقی

بہت اونچی ہو جاتی ہے ـــــ چھوٹی سرکار ایک دم ریڈیو بند کر دیتا ہے اور کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن فوراً ہی اٹھتا ہے اور دروازے کے پاس جا کر دستک دیتا ہے ـــــ دروازہ کھلتا ہے۔

چھوٹی سرکار: کٹاری۔

دروازہ پورا کھلتا ہے ـــــ گلاب دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں گرگابی کا ایک پیر ہے ـــــ کٹاری کا نام سن کر اس کا ردِ عمل۔

گلاب : دروازہ کس نے بند کیا تھا باہر سے۔

چھوٹی سرکار: کٹاری نے۔

گلاب : کٹاری نے؟

چھوٹی سرکار: ہاں ـــــ گرگابی کا پیر مل گیا۔

گلاب : جی ہاں۔

چھوٹی سرکار: آؤ اندر......

گلاب اندر آتا ہے اور کٹاری کے پرانے کپڑے دیکھ کر ٹھٹکتا ہے۔

گلاب : یہ کپڑے؟

چھوٹی سرکار: کٹاری کے ہیں (کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) دیکھو گلاب اس کا کچھ انتظام کرنا پڑے گا۔

گلاب : کس کا؟

چھوٹی سرکار: (پانسوں سے کھیلتا ہوا اٹھتا ہے) کٹاری کا...... آج غچّہ دے

گئی ہے مجھے ——— سب چیزیں لے گئی ——— سب

گیا، سو روپئے کا نوٹ بھی صاف کر کے چلتی بنی...... اور ہاتھ

تک نہ لگانے دیا مجھے۔

گلاب کا موزوں و مناسب ردِّ عمل۔

چھوٹی سرکار: ایک دن راہ پر تو آ ہی جائے گی لیکن میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا ———

معاملہ یوں پٹنا چاہیئے ——— یوں (چٹکی بجاتا ہے) تم ایسا کرو ———

یہ گرگابی کا پیر لے جاؤ اس کے ڈیرے اور اُس سے کہو کہ کل مجھ سے ملنے

آئے ——— اور چیزیں ملیں گی ——— سمجھے۔

گلاب : جی؟ ——— جی!

چھوٹی سرکار: میں سب انتظام کر رکھوں گا ——— بس کھالیا ایک غچّہ۔

گلاب گرگابی کا پیر میز پر رکھتا ہے اور سوچ میں غرق چلتا ہے۔

چھوٹی سرکار: کہاں چلے گلاب؟

گلاب : جی ——— کٹاری کے ڈیرے۔

چھوٹی سرکار: تو گرگابی کا یہ پیر تو لیتے جاؤ۔

گلاب : جی؟ ——— جی ہاں.....

گرگابی کا پیر اٹھاتا ہے اور چلا جاتا ہے ——— چھوٹی سرکار پانسے

ہلا کر پھینکتا ہے۔

ڈی سرکار: لو، چھ تین نو۔

چھ تین نو بن جاتے ہیں ——— چھوٹی سرکار ہنستا ہے۔

---

خانہ بدوشوں کا ڈیرہ (ڈمرو کا خیمہ) رات کا وقت۔

ڈمرو چٹائی پر بیٹھا ہے اور پانسے بنا رہا ہے

ڈمرو : لو بھئی ——— یہ لو کچے بارہ۔

کچے بارہ پھینکتا ہے۔

ڈمرو : صدقے جائیے راجہ نل کے ——— کچے بارہ ہی آئے (پانسے اٹھا کر

ہاتھ میں ہلاتے ہوئے) لو دوست اب چھ تین نو پھینکنا (پانسے پھینکتا ہے)

لو، دھرے پڑے ہیں، چھ تین نو۔

چھ تین نو بن جاتے ہیں۔ ڈمرو اپنے کندھے پر تھپکی دیتا ہے۔

ڈمرو : ڈمرو استاد میری پیٹھ پر جوگنی ہے جوگنی۔ لاؤ دوست ڈھیلے کر دو دس روپے۔

ڈمرو دس روپے پکڑتا ہے ——— کیمرہ پیچھے ہٹتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ

وہ اپنے دوسرے ہاتھ سے دس کا نوٹ لے رہا ہے ——— نوٹ

جیب میں رکھتا ہے ——— ڈب کھول کر بغیر سوئیوں کی گھڑی نکالتا

ہے۔ جمائی لیتا ہے۔

ڈمرو : وقت ہو گیا میرے سونے کا۔

چٹائی پر لیٹ جاتا ہے ــــــ کتا بھونکتا ہے: "عف عف"!

ڈمرو : ایک دو ــــــ مطلب ہے اپنا ہی آدمی آیا ہے۔

کتا بھونکتا ہے "عف عف"۔

ڈمرو : تین چار ــــــ نہیں باہر کا آدمی ہے۔

اٹھتا ہے اور خیمے کے باہر نکلتا ہے۔

---

خانہ بدوشوں کا ڈیرہ (ڈمرو کا خیمہ ــــــ بیرونی حصّہ) رات کا وقت۔

ڈمرو باہر نکلتا ہے تو اُسے گلاب دکھائی دیتا ہے۔

ڈمرو : کیوں بابو؟

گلاب : کٹاری کہاں ہے؟

ڈمرو : کیوں؟

گلاب : اس کے لئے ایک چیز لایا ہوں۔

ڈمرو : میرا خیال ہے اس وقت نہا کے سگرٹ پی رہی ہو گی ــــــ جانتے ہو کہاں۔

گلاب : جانتا ہوں۔

ڈمرو : میں بھی سب کچھ جانتا ہوں۔

گلاب : کیا؟

ڈمرو : کچھ نہیں —— جاؤ۔

گلاب چلتا ہے۔

---

خانہ بدوشوں کا ڈیرہ (جھرنا —— رات کا وقت)

کٹاری پتھروں پر ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی ہے —— ایک ہاتھ میں سگرٹ ہے —— آہستہ آہستہ آنکھیں بند کرتی ہے —— ہاتھ جس میں سگرٹ ہے، ڈھیلا ہو کر لٹک جاتا ہے۔ سگرٹ پانی کی سطح کے ساتھ چھو جاتا ہے اور ایک دم بجھ جاتا ہے —— کٹاری چونکتی ہے —— مسکراتی ہے اور سگرٹ پھینک کر پھر آنکھیں بند کر لیتی ہے —— تھوڑے توقف کے بعد گلاب کی آواز آتی ہے۔

گلاب : کٹاری۔

کٹاری : (آنکھیں کھول کر) کون —— اوہ گلاب —— (اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے)

آؤ —— آؤ!

گلاب آتا ہے —— کاغذ کھول کر گرگابی کا پیر نکالتا ہے۔

کٹاری : (خوش ہو کر) مل گیا تھا تمہیں۔

گلاب :۔ ہاں

اور یہ کہہ کر وہ زور سے گرگابی کا پیر پانی پر دے مارتا ہے ـــ کٹاری گلاب کی اس حرکت پر سخت متحیر ہوتی ہے ـــ گلاب واپس چلنے کے لیے مڑتا ہے۔

کٹاری :۔ گلاب۔

گلاب :۔ نام نہ لاؤ میرا اپنی زبان پر۔

کٹاری :۔ کیا ہوا تمہیں؟ ـــ منہ کیوں سوجا ہوا ہے تمہارا؟

گلاب :۔ تم نے چانٹا جو مارا ہے۔

کٹاری :۔ چانٹا؟ ـــ میں نے؟

گلاب : ہاں! تم نے (ایک دم مڑ کر) کیوں گئی تھیں تم چھوٹی سرکار کے پاس؟

کٹاری : اوہ (ہنستی ہے اور لہنگے کی جیب سے سو روپے کا نوٹ نکالتی ہے) یہ لینے ـــ تمہارے واپس جو دینے تھے۔

گلاب : مجھے نہیں چاہیئے۔

کٹاری : لے لو گلاب ـــ اب تو ہماری تمہاری دوستی ہے ـــ پہلے اور بات تھی ـــ لو۔

گلاب : (نوٹ لیکر پرزے پرزے کر دیتا ہے) یہ لو۔

کٹاری : (سخت متحیر ہو کر) کیا ہوا ہے تمہیں۔

گلاب : میرے بس میں ہوتا تو تمہارے ان کپڑوں کو بھی چندی چندی کر دیتا۔ جو تم اس

بدمعاش سے لائی ہو ـــــ تمہیں شرم نہیں آتی۔

کٹاری : کس بات کی ؟

گلاب : بھولی مت بنو کٹاری ـــــ مفت میں کوئی اتنی چیزیں اور روپے نہیں دیا کرتا۔

...... کیوں لیے تم نے اس سے یہ کپڑے ؟

کٹاری : پھلان کا شوق ہے۔

گلاب : اسے بھی کچھ شوق ہے......

---

کٹاری : کیا ؟

گلاب : پتا چل جائے گا تمہیں۔

کٹاری : اونہہ ـــــ ایسے میں نے کئی دیکھے ہیں ـــــ میں اس انگلی پر نچا سکتی ہوں اُسے۔

گلاب : میں تم سے صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ اب مت جانا وہاں۔

کٹاری : کیوں نہ جاؤں ـــــ اس کے پاس دولت ہے ـــــ اور مجھے اپنے ہار سنگھار کے لیے اتنی چیزیں چاہئیں۔

گلاب : میں کہتا ہوں تم نہیں جاؤ گی۔

کٹاری : میں جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی ـــــ اتنی دیر کے بعد کام کا آدمی ملا ہے۔

گلاب : ( زہر خند کے ساتھ ) اور اس کام کے آدمی کے پاس اپنا آپ چند ریشمی کپڑوں کے بدلے بیچو گی۔

کٹاری : ( ایک دم گلاب کے منہ پر چانٹا مارتی ہے ) بکو نہیں۔

گلاب خاموش کھڑا رہتا ہے۔

کٹاری : (چلا کر) جاؤ ـــــ جاؤ ـــــ جاؤ ـــــ چلے جاؤ یہاں سے

(گلاب کو دھکا دیتی ہے۔

گلاب چلا جاتا ہے تو کٹاری پتھر اٹھا اٹھا کر پھینکتی ہے ...... گلاب

گلاب خاموش چلتا رہتا ہے ـــــ کٹاری رونا شروع کر دیتی ہے۔

کٹاری : یہ کہہ کر وہ زمین پر پتھروں اور کنکروں کو ٹھوکریں مارتی چلتی ہے۔

---

خانہ بدوشوں کا ڈیرہ (ڈمرو کا خیمہ) رات کا وقت۔

ڈمرو چٹائی پر سو رہا ہے ـــــ زور سے ایک پتھر لڑھکتا ہوا اندر آتا ہے اور ڈمرو کے لگتا ہے۔ ڈمرو گھبرا کر اٹھتا ہے اور پتھر دیکھتا ہے۔

کٹاری کی آواز آتی ہے۔

کٹاری : میں جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی۔

سخت غصے اور چڑچڑے پن کے عالم میں کٹاری اندر داخل ہوتی ہے اور دو تین چیزیں اٹھا کر زمین پر دے مارتی ہے۔

کٹاری : مجھے اپنے ہار سنگھار کے لئے اتنی چیزیں چاہئیں ـــــ اس کنگلے کے پاس کیا ہے .... (دو ایک چیزیں اور اٹھا کر دے مارتی ہے)

ڈمرو : کٹاری۔

کٹاری : محبت کرتا ہے مجھ سے ..... محبت نہ ہوئی پنجرہ ہو گیا ..... تم

نہیں جاؤ گی ..... واہ ـــــ میں جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی۔

ڈمرو : کٹاری۔

کٹاری : بک نہیں ...... مجھے ریشمی کپڑے چاہئیں ....... مجھے

بہت سے ریشمی کپڑے چاہئیں ...... مجھے ڈھیروں ریشمی کپڑے

چاہئیں ..... میں جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی ..... اس کو چڑانے

کے لئے جاؤں گی ..... لیکن ..... لیکن میں نے اُسے کیوں مارا

(رونا شروع کر دیتی ہے) میں نے اُسے کیوں مارا ـــــ (ایک دم

موڈ بدل کر) مارا ہے ٹھیک مارا ہے ..... اس نے کیوں کہا کہ میں بیچ

دوں گی اپنے کو ..... میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا ..... روتی روتی باہر

نکل جاتی ہے۔

ڈمرو : (بڑے فلسفیانہ انداز میں) کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تو اس کا یہ مطلب ہے

ـــــ عشق ہو گیا ہے لونڈیا کو ...... اور یہ کاروبار کے لئے کوئی مفید

چیز نہیں .....

ڈمرو چٹائی پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

ڈمرو : لیکن اس کا علاج کر دیا جائے گا۔

---

## فیڈ آؤٹ

بڑی سرکار کی حویلی (باغ ——— فوارہ)

گلاب فوارے کی منڈیر پر بیٹھا ہے ——— فوارہ چل رہا ہے۔ گلاب پانی کی بوندوں کے ساتھ کھیل رہا ہے ——— تھوڑے وقفے کے بعد ایک گلاب کا پھول گلاب کے چہرے کے ساتھ ٹکرا کر پانی میں گر جاتا ہے۔ ——— گلاب کا ردِ عمل ——— اِدھر اُدھر دیکھتا ہے ——— کوئی نظر نہیں آتا ——— اٹھتا ہے کہ ایک گلاب کا پھول اور اس کے سر پر لگتا ہے ——— آواز آتی ہے۔

چمیلی : گلاب!

گلاب : کون ہے؟

گلاب اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ دس پندرہ قدم چل کر جھاڑی کے پاس پہنچتا ہے۔ آواز آتی ہے۔

چمیلی : گلاب۔

چمیلی جھاڑی کے عقب سے نکلتی ہے اور ہنستی ہے۔

گلاب : اوہ! ——— چمیلی!

چمیلی گلاب کے پھول کی پتیاں نوچتی ہوئی گلاب کے پاس آتی ہے۔

چمیلی : تم ہم سے بات ہی نہیں کرتے!

گلاب : (بے اعتنائی سے) میرے منہ میں وہ زبان نہیں جو چھوٹی سرکار کے منہ میں ہے۔ چمیلی بُرا سا منہ بناتی ہے —— گلاب ایک طرف ہٹ جاتا ہے۔

—— چمیلی اس کی طرف بڑھتی ہے۔

چمیلی یہ کٹاری کون ہے؟

گلاب : مجھے معلوم نہیں۔

چمیلی : چھوٹی سرکار کو تو بہت پسند ہے —— کل اتنی چیزیں لا کے دیں اُسے۔

گلاب : دی ہوں گی ——

چمیلی : تم نے آج تک مجھے کچھ نہیں دیا۔

گلاب : غریب آدمیوں کے پاس دینے کے لئے چیزیں نہیں ہوتیں —— ایک دل ہوتا ہے۔

چمیلی : (ایک دم) اور وہ ....؟

گلاب : میں دے چکا ہوں!

چمیلی : کسے؟

گلاب : جو لے گیا!

چمیلی : بتاؤ نا، کون ہے وہ؟

باتیں کرتے کرتے دونوں گیٹ کے پاس پہنچ جاتے ہیں —— ایک دم

کٹاری داخل ہوتی ہے ——— اس وقت چمیلی اپنا مکالمہ ادا کرتے ہوئے

پھول کی پتیاں گلاب کے منہ پر پھینکتی ہوتی ہے ——— گلاب،

چمیلی اور کٹاری کا ردِ عمل ——— کٹاری ایک لحظے کے لئے رکتی ہے،

بہت ہی بے رُخی سے گلاب کی طرف دیکھتی ہے۔

کٹاری : چھوٹے سرکار ہیں اندر؟

گلاب جواب نہیں دیتا، کٹاری چلتی ہے ——— گلاب دیکھتا رہ جاتا ہے۔

چمیلی (غصّے میں، کٹاری سے) اے ——— کدھر جاتی ہے تو؟

کٹاری کو روکنے کے لئے بڑھتی ہے۔ گلاب اُسے پکڑ لیتا ہے۔

گلاب : جانے دے جدھر جاتی ہے۔

کٹاری مسکراتی ہوئی چلی جاتی ہے

---

بڑی سرکار کی حویلی (چھوٹے سرکار کا کمرہ)

دہلیز میں کالو کھڑا ہے ——— چھوٹے سرکار اس سے مخاطب ہوتا ہے۔

چھوٹے سرکار: "سمجھ گئے نا سب کچھ"

کالو : جی ہاں سرکار۔

کٹاری کے آنے کی آواز آتی ہے ——— چھوٹے سرکار کالو کو آنکھ مارتا

ہے ——— کٹاری نمودار ہوتی ہے۔ مسکراتی ہوئی۔

کٹاری : آنکھ تو تم خوب مارتے ہو۔

آنکھ مار کر مسکراتی ہے ۔

چھوٹی سرکار: آؤ ـــــــ اندر آؤ۔

کٹاری تھرکتی ہوئی اندر داخل ہوتی ہے ـــــــ چھوٹی سرکار دروازہ بند کرکے چٹخنی چڑھاتا ہے۔ کٹاری کا خفیف سا ردِ عمل ۔

کٹاری : (شرارت کے ساتھ) کوئی آنہ جائے ـــــــ کیوں ؟

چھوٹی سرکار مسکرا کر اثبات میں سر ہلاتا ہے ۔

باہر سے چٹخنی لگانے کی آواز آتی ہے ـــــــ کٹاری تیر کی طرح دروازے کی جانب بڑھتی ہے ـــــــ اندر کی چٹخنی چشم زدن میں کھولتی ہے، لیکن دروازہ باہر سے بند ہو چکا ہے ـــــــ بلّی کی طرح تیز تیز نگاہوں سے چھوٹی سرکار کو گھورتی ہے اور پھر لپک کر دوسرے دروازے کی طرف بڑھتی ہے ـــــــ جوں ہی اس کے پاس پہنچتی ہے، باہر سے کنڈی چڑھانے کی آواز آتی ہے ـــــــ تیسرے دروازے کی طرف لپکتی ہے مگر وہ بھی باہر سے بند ہو جاتا ہے ـــــــ کٹاری اپنے اعضا ڈھیلے چھوڑ کر تھرکتی ہوئی چھوٹی سرکار کے پاس جاتی ہے اور ایک ادا کے ساتھ کہتی ہے ۔

کٹاری : یہ بات ہے ؟

چھوٹی سرکار مسکراتا ہے —— کٹاری پینترہ بدل کر کھڑکی کی طرف لپکنا چاہتی ہے مگر چھوٹی سرکار دوڑ کر اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔

چھوٹی سرکار: آج میں کوئی پیش نہیں چلنے دوں گا۔

کٹاری : (بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی کٹاری نکال کر) یہ پیش قبض بھی نہیں؟

چھوٹی سرکار: کٹاری!

کٹاری اپنی پیش قبض کو زور سے پھینکتی ہے —— چھوٹی سرکار کھڑکی کے آگے سے ہٹ جاتا ہے —— پیش قبض باہر نکل جاتی ہے۔

---

بڑی سرکار کی حویلی (باغ)

گلاب خاموش کھڑا ہے —— پیش قبض اس کے پاس گرتی ہے —— گلاب اسے اٹھاتا ہے —— کٹاری کی آواز آتی ہے۔

"گلاب —— گلاب"

---

بڑی سرکار کی حویلی (چھوٹی سرکار کا کمرہ)

چھوٹی سرکار کا ہاتھ کٹاری کے منہ پر ہے —— کٹاری گرفت سے نکلنا چاہتی ہے —— دونوں ایک دوسرے سے گتھ جاتے ہیں چھوٹی سرکار اُس کے ہاتھ اس کی پیٹھ پیچھے باندھ دیتا ہے اور منہ

میں رُومال ٹھونس دیتا ہے ــــــ کٹاری پلنگ پر پڑی صرف ٹانگیں چلاتی ہے ــــــ چھوٹی سرکار اس کی بے بسی پر خوش ہوتا ہے۔

چھوٹی سرکار: (ہانپتے ہوئے) اب کہاں جائے گی تو؟

دراز دستی کرنے لگتا ہے ــــــ کٹاری ٹانگیں چلاتی ہے ــــــ اس کے منہ سے رومال نکل جاتا ہے۔

کٹاری : گلاب!

چھوٹی سرکار اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے ــــــ ایک دم دروازہ بہت ہی زور سے کھلتا ہے ــــــ گلاب تیزی سے داخل ہوتا ہے اور پلنگ سے کچھ دُور رک جاتا ہے۔

چھوٹی سرکار: (حیرت سے) تم؟

گلاب : ہاں چھوٹی سرکار۔

چھوٹی سرکار: چلے جاؤ یہاں سے۔

گلاب : (کٹاری سے) کٹاری، چلی جاؤ یہاں سے۔

چھوٹی سرکار: (غصے میں) میں تم سے کہہ رہا ہوں۔

گلاب : (کٹاری سے) میں تم سے کہہ رہا ہوں کٹاری۔

یہ کہہ کر گلاب کٹاری کو اٹھاتا ہے ــــــ چھوٹی سرکار آگ بگولا ہو جاتا ہے اور بڑھ کر گلاب کے چانٹا مارتا ہے۔

**چھوٹی سرکار:** بدتمیز ——— چل دور ہو یہاں سے ۔

یہ کہہ کر چھوٹی سرکار کٹاری کو پکڑنا چاہتا ہے مگر گلاب چھوٹی سرکار کی ٹھوڑی کے نیچے اس زور سے گھونسہ جماتا ہے کہ وہ لڑکھڑاتا ہُوا پلنگ پر جاگرتا ہے ——— گلاب کٹاری کو گھسیٹتا ہُوا کمرے سے باہر لے جاتا ہے ——— پلنگ پر چھوٹی سرکار اپنی ٹھوڑی سہلاتا ہُوا اٹھتا ہے اور کھڑکی کی طرف بڑھتا ہے ۔

---

بڑی سرکار کی حویلی (گیٹ)

کٹاری اور گلاب کھڑے ہیں ۔

**گلاب :** جاؤ کٹاری ۔

**کٹاری :** سُنو تو ۔

**گلاب :** میں کچھ سننا نہیں چاہتا ۔ چلی جاؤ یہاں سے ۔

کٹاری کو دھکیلتا ہے ۔

**کٹاری :** (ناراضگی کے ساتھ) ہائے ——— دھکے تو نہ مارو ۔

**گلاب :** تم اسی قابل ہو ۔

**کٹاری :** ہونہہ ——— مجھے بچا لیا گیا ہے ۔ سر پہ ہی چڑھ بیٹھے ہو ۔

گلاب گیٹ بند کر دیتا ہے ۔

کنّاری : (چند قدم چلتی ہے اور پلٹتی ہے) گلاب!

گلاب : کیا ہے؟

میں کیسی بھی ہوں، پر تمہارے دل میں یہ خیال نہ رہے کہ میں کسی کا احسان

نہیں مانتی ——— تم نے مجھے بچایا ہے ——— شکریہ!

یہ کہہ کر کنّاری تھرکتی ہوئی چلی جاتی ہے ——— گلاب پلٹتا ہے ———

چند قدم چلتا ہے ——— چھوٹی سرکار کی آواز آتی ہے۔

چھوٹی سرکار: گلاب!

گلاب : (پہلے سر اٹھاتا ہے پھر جھکا لیتا ہے) آیا حضور!

---

بڑی سرکار کی حویلی (بڑا کمرہ)

ہم ڈزالو کرتے ہیں ——— گلاب سر جھکائے کھڑا ہے۔

گلاب : جی حضور!

بڑی سرکار کی گرج دار آواز آتی ہے۔

بڑی سرکار: تم اگر ہمارے وفادار منشی کے لڑکے نہ ہوتے تو اس گستاخی کی سزا جو تم نے

چھوٹی سرکار کے ساتھ کی ہے یہ ہوتی کہ ہم کھڑے کھڑے تمہاری کھال ادھیڑ

دیتے۔ کیمرہ اب بڑی سرکار اور منشی پر بھی ہے ——— منشی ہاتھ باندھے

کھڑا ہے اور بڑی سرکار تخت پر بیٹھے ہیں۔

بڑی سرکار: (گاؤ تکیے کے ساتھ ٹیک لگا کر) بہت زیادہ نرمی برت کر ہم تمہیں یہ سزا دیتے ہیں کہ فوراً یہاں سے نکل جاؤ . . . .

منشی کا ردِ عمل .

بڑی سرکار: اور کبھی ادھر کا رُخ نہ کرو ——— منشی صاحب کیا ہم مہربان نہیں .

منشی : (ہاتھ جوڑ کر) سرکار آپ مہربان نہ ہوتے تو یہ غلام اس نالائق کو پال پوس کر اتنا بڑا کیسے کر سکتا تھا . . . . مجھے افسوس ہے کہ اس سے ایسی حرکت سرزد ہوئی .

بڑی سرکار: ہم نے جو سزا اس کے لئے منظور کی ہے آپ کو منظور ہے ؟

منشی : سرکار میری کیا مجال ہے کہ . . . . .

---

گلاب : لیکن حضور جو واقعات ہیں، کیا آپ کو ان کا علم ہے ؟

بڑی سرکار: (ایک دم گاؤ تکیے کی ٹیک سے الگ ہو کر) لڑکے . . . . . نوکر کی زبان اس کی گدی ہی میں رہنی چاہیئے ——— اس کا تمہیں علم ہے ؟

منشی : گلاب ! تم بہت گستاخ ہو گئے ہو ——— معافی مانگو بڑی سرکار سے .

گلاب ، باپ کی طرف دیکھتا ہے پھر ایک نظر بڑی سرکار کی طرف اور خاموش چلا جاتا ہے .

---

بڑی سرکار کی حویلی (بڑا کمرہ ——— بیرونی حصّہ)

گلاب باہر نکلتا ہے —— چھوٹی سرکار ایک طرف کھڑا ہے —— وہ مسکراتا ہے —— گلاب اس مسکراہٹ کا جواب دیئے بغیر چلا جاتا ہے۔

---

فیڈ آؤٹ

---

بڑی سرکار کی حویلی (باغ)

مالی کیاریاں درست کرنے میں مصروف ہے —— چمیلی بھی اس کا ہاتھ بٹا رہی ہے۔

چمیلی : (تھک کر) مجھ سے یہ کام نہیں ہوتا۔

مالی : (معنی خیز لہجے میں) نہیں ہوتا تو نہ کیا کر —— تجھے کون مجبور کرتا ہے۔

چمیلی : ٹھیک ہے، پر اکیلے میں کیا کیا کروں۔

مالی : جو بھی تجھے سوجھے!

اتنے میں منشی نمودار ہوتا ہے۔

مالی : آیئے منشی صاحب، آیئے۔

منشی آتا ہے۔ افسردہ ہے۔

مالی : کہیئے گلاب کا کچھ پتہ لگا یا؟

منشی : نہیں۔

مالی : آپ کی اولاد ہے ـــــ دل پر اس طرح پتھر نہیں رکھ لینا چاہیئے۔

منشی : کیا کروں ـــــ بھائی مجبور ہوں ـــــ (پاس بیٹھ جاتا ہے) مجھ میں اتنی ہمت نہیں۔

مالی : اچھے باپ ہیں آپ منشی صاحب،

منشی : میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکالی۔۔۔۔ جب سے وہ گیا ہے میرے دل کی بہت بری حالت ہے ـــــ تم سمجھتے ہو کہ مجھے اس کا درد نہیں ـــــ تم سمجھتے ہو کہ میں اُسے قصور وار سمجھتا ہوں ـــــ نہیں، نہیں، نہیں۔

مالی : میں پتا لوں گلاب کا؟

منشی : (آہستہ) نہیں!

چھوٹی سرکار کی آواز آتی ہے۔

چھوٹی سرکار: مالی۔

مالی : (ایک دم کھڑے ہو کر) حضور!

چھوٹی سرکار: ہمارے کمرے کے گلدانوں میں کل کے ہی باسی پھول پڑے جھک مار رہے ہیں ـــــ وجہ؟

مالی : (چمیلی کی طرف دیکھ کر) حضور. یہ چمیلی کا قصور ہے۔
چھوٹی سرکار تو بھیجو اسے جلدی کہ نئے پھول سجائے۔

چھوٹی سرکار چمیلی کی طرف کنکھیوں سے دیکھتا ہوا چلا جاتا ہے
مالی معنی خیز نظروں سے چمیلی کی طرف دیکھتا ہے۔

مالی : جاؤ چمیلی ——— تازہ پھول فوارے کے پاس پڑے ہیں۔

چمیلی آہستہ آہستہ چلی جاتی ہے ——— مالی پھر اپنے کام میں
مشغول ہو جاتا ہے۔

مالی : (بڑبڑاتے ہوئے) آپ نے کیوں گلاب کو جانے دیا ——— کیا آپ
کو ساری بات معلوم نہیں تھی۔

منشی : تم نے چمیلی کو کیوں جانے دیا۔

مالی چونکتا ہے۔

منشی : کیا تمہیں ساری بات معلوم نہیں ہے؟

مالی : (ایک دم اٹھ کر) کیا؟

منشی : مجھ سے کیا پوچھتے ہو، اپنے دل سے پوچھو۔

مالی : بتائیے، بتائیے منشی صاحب ——— آپ کو کیا معلوم ہے۔

منشی : میں کہہ چکا ہوں اپنے دل سے پوچھو۔

مالی : اپنے دل سے . . . . (آہستہ) میرا دل ہے کہاں۔

منشی : تم مجھ سے کہہ رہے تھے، اچھے باپ ہیں آپ منشی صاحب —— میں
کہتا ہوں —— کیا تم باپ نہیں —— تم نے کہا تھا گلاب آپ
کی اولاد ہے، دل پر اس طرح پتھر نہیں رکھ لینا چاہیئے —— میں
کہتا ہوں، چمیلی تمہاری اولاد ہے —— تم نے کیوں اپنی آنکھوں
پر پٹی باندھ رکھی ہے۔

مالی : (ایک دم خاموش اور سنجیدہ ہو جاتا ہے)

منشی : جو کھیل تمہاری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے، انسان کی آنکھوں پر
پٹی بندھی ہو تو بھی دیکھ سکتا ہے ...... لیکن تم اتنے بے غیرت ہو.....

مالی : بس!

منشی میں غلام ہوں —— میرا باپ دادا غلام تھا —— صدیوں
کی غلامی میرے خون میں رچی ہوئی ہے —— بے قصور گلاب کو
یہاں سے نکالا گیا، میں اُف تک نہ کر سکا —— اس کہ مجھ میں
جرأت نہیں تھی، پر میں خوش ہوں کہ میرا بیٹا اس گندگی سے نکل گیا
جو کچھ دنوں سے یہاں پھیل رہی ہے۔
تم تو ایک لڑکی کے باپ ہو مالی —— چمیلی میری بیٹی
ہوتی .....

مالی : ایسی بات منہ سے نہ نکالو۔

منشی : کیوں؟

مالی : چمیلی تمہاری بیٹی کیوں ہو۔

منشی : (حیرت سے) کیا مطلب؟

مالی : ادھر آؤ۔

منشی حیرت زدہ اس کے ساتھ چلتا ہے ——— کوارٹر تک دونوں خاموش چلتے رہے ہیں۔

مالی : آجاؤ اندر۔

منشی کوارٹر میں داخل ہو جاتا ہے۔

---

بڑی سرکار کی حویلی (مالی کا کوارٹر)

منشی اور مالی دونوں اندر آتے ہیں۔

مالی : (کھاٹ کی طرف اشارہ کر کے، منشی سے) بیٹھ جاؤ!

منشی خاموش کھاٹ پر بیٹھ جاتا ہے ——— مالی کچھ دیر اِدھر اُدھر ٹہلتا ہے، پھر ایک دم رُک کر منشی سے کہتا ہے۔

مالی : چمیلی میری لڑکی نہیں ہے منشی صاحب۔

منشی اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

منشی : چمیلی تمہاری لڑکی نہیں ہے؟

مالی : نہیں۔

اور بے تحاشا ہنسنا شروع کر دیتا ہے ـــــ پھر ایک کونے میں رکھے ہوئے پلنگ کی طرف دیکھتا ہے اور ایک دم خاموش ہو جاتا ہے۔

مالی : وہ ..... یہاں لیٹی ہوئی تھی .....

منشی : کون ؟

مالی : میری بیوی (اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں ، آخری سانس تھے ..... بچی کی پیدائش کی جتنی خوشی ہوئی تھی ، سب دکھ بن گئی تھی ..... اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے ..... ایکا ایکی بچی دودھ کے لئے بلکنے لگی۔ میں نے کہا دو آخری گھونٹ تو میری بیٹی کو دیتی جاؤ ..... یہ سُن کر اُس نے مندی مندی آنکھوں سے اپنی بچی کی طرف دیکھا۔ پھر میری طرف آنکھیں اٹھائیں اور یہ خوفناک بات کہی "یہ تمہاری بیٹی نہیں ہے مالی" ـــــ یہ سارا کوارٹر میری آنکھوں تلے گھوم گیا ـــــ "کس کی ہے ؟" میں نے پوچھا..... اس نے جواب دیا "بڑی سرکار کی ـــــ گلا گھونٹ دو اس کا ـــــ یہ سُن کر مجھے کوئی ہوش نہ رہا ـــــ مجھے معلوم نہیں۔ اس گناہگار کی کب جان نکلی .....

یہ کہکر مالی خاموش ہو جاتا ہے ـــــ منشی حیرت زدہ ، گم سُم کھاٹ پر

بیٹھ جاتا ہے، تھوڑے توقف کے بعد وہ گردن اٹھا کر مالی سے مخاطب ہوتا ہے۔

منشی : تم نے گلا کیوں نہ گھونٹا اس شیطان کی بچی کا۔

مالی : میں گلا گھونٹنے والا تھا ——— لیکن میرے مَن کے اندر ایک شیطان پیدا ہوا ...... اس نے مجھ سے کہا نہیں مالی ——— اسے زندہ رہنے دو ...... اس کو پال پوس کر بڑا کرو ——— بڑی سرکار کا ایک لڑکا ہے ——— جوان ہو کر وہ بھی باپ کی طرح کھُل کھیلے گا ...... کیا پتا ہے کہ یہ حرام کی بچی اور وہ ......

منشی : (ایک دم چیخ اٹھتا ہے) بس، بس ——— بس۔

مالی : ابھی بس کہاں ...... میں اپنے دل کے پھوڑے کو چودہ برس تک پکاتا رہا ہوں ——— اب تو اُس کے پھوٹنے کا وقت اور بہہ جانے کا وقت ہے ...

---

# پسینہ

"میرے اللہ آپ تو پسینے میں شرابور ہو رہے ہیں۔"

"نہیں — کوئی اتنا زیادہ تو پسینہ نہیں آیا—"

"ٹھہریئے میں تولیہ لے کر آؤں—"

"تولیے تو سارے دھوبی کے ہاں گئے ہوئے ہیں—"

"تو میں اپنے دوپٹے سے ہی آپ کا پسینہ پونچھ دیتی ہوں"

"تمہارا دوپٹہ ریشمیں ہے پسینہ جذب نہیں کر سکے گا۔"

"پسینے کے یہ قطرے مجھ سے نہیں دیکھے جاتے — آپ کا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ ریشمی کپڑا پانی جذب نہیں کر سکتا — لیکن میں آپ کا تولیہ ہوں۔ کیا میں آپ کا پسینہ خشک نہیں کر سکتی۔"

"آج گرمی زیادہ تھی — سائیکل پر یہاں آتے آتے میں قریب بیہوش ہو گیا تھا۔"

"ہائے اللہ۔"

"نہیں — بس میں چند منٹوں میں ٹھیک ہو گیا — ایک دوست تھا اس نے مجھے آموں کا شربت پلا دیا —"

"آموں کا شربت بھی ہوتا ہے۔"

"ہر شے کا شربت بنایا جا سکتا ہے۔"

"میرا بھی —"

"تمہارا شربت تو میں ہر روز پیتا ہوں — لیکن اس کا ذائقہ اچھا نہیں ہوتا۔"

"شریر کہیں کے۔"

"شرارت تو تمہاری ہوتی ہے کہ تم مٹھاس میں کھٹائی ڈال دیتی ہو۔"

"کھٹائی تو آپ ڈالتے ہیں — میں تو مصری کی ڈلی ہوں۔"

"مانتا ہوں — لیکن کبھی کبھی —"

"آپ مجھ سے وہ زیادہ نہ کیجئے — ادھر آئیے — میں آپ کی ٹائی اتار دوں —"

"آج اتنا تکلف کیوں کیا جا رہا ہے؟"

"آپ محبت کو تکلف کہتے ہیں —"

"اس سے متعلق میں تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا — ویسے میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اتنی محبت کا اظہار تم نے پہلے کبھی نہیں کیا۔"

"آپ محبت کو کیا جانیں —"

"انسان اگر محبت ہی کو جان پہچان نہیں سکتا تو میں سمجھتا ہوں ــ وہ حیوان بھی نہیں ــــ کوئی بےحس چیز ہے ــــ پتھر ہے ــــ سڑک پر گرا ہوا روڑا ہے۔"

"ادھر آئیے میں آپ کی ٹائی اتار دوں ــ"

"اس تکلّف کی کیا ضرورت ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ تکلّف کی بات کیوں کرتے ہیں" میں نے کبھی آپ سے تکلّف برتا ہے"

"آج پہلی مرتبہ ــ"

"آپ اتنے ذہین ہیں ــــ بتائیے اس تکلّف کی وجہ کیا ہے"

"میں اتنا ذہین نہیں ہوں۔"

"آپ کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہیں۔"

"جناب میں کسرِ نفسی سے کام نہیں لے رہا ــــ ایک حقیقت تھی جو میں نے بیان کر دی ــــ"

"میرے پاس تو آئیے ــــ میں آپ کا پسینہ پونچھ دوں ــ گرمی میں بے حال ہو کر آ رہے ہیں ــ"

"کوئی اتنی زیادہ بے حالی نہیں ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ آج درجہ حرارت بہت بڑھا ہوا ہے سننے میں آیا ہے کہ آج دس آدمی اس حدت کے باعث مر گئے ہیں۔"

"میں کہتی ہوں ــ آپ اتنے روپے خرچ کرتے ہیں کیوں نہیں گھر میں

ایک کولر لے آتے۔"

"کولر کی کیا ضرورت ہے تم خود بہت بڑی کولر ہو۔ اتنی گرمی میں گھر آیا ہوں تمہاری باتوں ہی نے ایسی ٹھنڈک پہنچا دی ہے جو سب سے بڑا کولر بھی نہیں پہنچا سکتا"

"آپ نے اب میرا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔"

"تمہاری قسم ــــ میں ایسی گستاخی کبھی نہیں کرتا۔"

"میری قسم آپ نے کیوں کھائی ہے"

"اس لئے کہ بڑی لذیذ ہے۔"

"یعنی آدمی کو وہی قسمیں کھانی چاہئیں جو مزیدار ہوں۔"

"یقیناً ــــ"

"آپ سے میں کبھی جیت نہیں سکتی۔"

"میں تو ہمیشہ ہارتا رہا ہوں۔"

"آپ کب ہارے ہیں ــــ ہار تو ہمیشہ میری ہی ہوتی رہی ہے۔"

"اچھا ــــ اب ذرا میں آرام کرنا چاہتا ہوں ــــ میری شلوار قمیض تو نکال دو۔"

"الماری میں صرف ایک پائجامہ موجود ہے"

"بنیان ہوگی ــــ"

"جی نہیں ــــ تین میلی پڑی ہیں جو نوکرانی ابھی نہیں دھو سکی"

"ایسی چھوٹی چھوٹی چیزیں تو تمہیں خود دھو لینی چاہئیں۔"

"آپکو کیا معلوم کہ صابن کتنا واہیات ہوتا ہے —— چھالے پڑ جاتے ہیں ہاتھوں میں ——"

"نوکروں کے ہاتھوں میں بھی یقیناً چھالے پڑتے ہوں گے۔"

"آپ ہمیشہ نوکروں کی طرفداری کرتے ہیں ——"

"کیا وہ انسان نہیں۔"

"خیر چھوڑیئے اس قصے کو —— ادھر آیئے —— میں آپ کی ٹائی اتار دوں ——"

"یہ کونسی اتنی بڑی مہم ہے جو آپ سر کرنا چاہتی ہیں۔"

"میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتی —— یہ بتایئے کہ آپ کو چلنے میں تکلیف کیوں محسوس ہو رہی ہے"

"جوتا ذرا تنگ ہے"

"یہ وہی ہے نا جو آپ نے پچھلے مہینے لیا تھا۔"

"ہاں۔ وہی ہے —— آج پہلی مرتبہ پہنا ہے"

"دیکھ کے نہیں لیا تھا ——"

"دیکھ کر ہی لیا تھا —— پہنا بھی تھا —— پر ——"

"چھوٹا کیسے ہو گیا ——"

"جو چیز استعمال نہ کی جائے سکڑ جاتی ہے"

"یہ عجیب منطق ہے"

"عورتوں کو اپنے خاوندوں کی ہر بات عجیب منطق معلوم ہوتی ہے۔"

"میں نے کہا ادھر آیئے آپ کی ٹائی اتار دوں۔"

"پہلے تو میں یہ تکلیف دہ جوتے اتارنا چاہتا ہوں۔"

"بیٹھ جایئے ـــــ میں اتار دیتی ہوں۔"

"آج تم اتنی مہربان کیوں ہو ـــــ؟ پہلے تو.....؟"

"آپ نخرے نہ بگھاریئے ـــ بیٹھئے کرسی پر ـــــ"

"یہاں سب کرسیاں اس قابل کہاں ہیں کہ اُن پر آدمی بیٹھے۔"

"میں نے آپ سے کہا تھا کہ جب ان کا بید بالکل ناکارہ ہو جائے گا تو میں سب کی سب ٹھیک کروا دوں گی۔"

"یہ تمہاری عجیب منطق تھی جس کے متعلق میں نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا تھا کہ مبادا تم ناراض ہو جاؤ۔"

"بات دراصل یہ ہے کہ میں چاہتی تھی کہ جب تک یہ کرسیاں کام دیتی ہیں ان کی مرمت نہ کرائی جائے ـــــ کیونکہ انہیں مقررہ وقت پر پھر مرمت طلب ہونا ہے۔ جتنے دن نکل جائیں ٹھیک ہے۔"

"میرا خیال ہے تم بھی مرمت طلب ہو۔"

"دیکھئے ـــ میں ایسی باتیں پسند نہیں کرتی ـــــ آپ بڑے بے لگام ہوتے جا رہے ہیں۔"

"چلئے میں خاموش ہو جاتا ہوں ـــــ۔"

"آپ خاموش ہی اچھے لگتے ہیں"

"آپ خاموش کیوں ہو گئے۔"

"تم ہی نے تو مجھ سے کہا ہے کہ آپ خاموش ہی اچھے لگتے ہیں"

"میں نے تو یہ نہیں کہا تھا کہ آپ منہ میں گھنگھنیاں ڈال کے بیٹھ رہیں"

"تم مجھے کچھ کھانے کے لئے دو۔"

"میں کیا دوں — آپ باہر سے کھا کر آرہے ہیں"

"تم نے کیسے جانا۔"

"آپ کی یہ پتلون بتا رہی ہے — سالن کے داغ لگے ہیں۔ ضرور آپ نے کسی ہوٹل میں اپنے دوست کے ساتھ عیاشی کی ہو گی۔"

"عیاشی تو خیر نہیں کی — لیکن مجبوراً اپنے افسر کے ساتھ ایک دعوت میں شریک ہونا پڑا — اور تم جانتی ہو۔ اچھی طرح جانتی ہو کہ میں نے صرف چند لقمے منہ میں ڈالے اور ہاتھ اٹھا لیا — اس لئے کہ کھانا بڑا واہیات تھا اس میں تمہارے ہاتھوں کا نمک نہیں تھا۔"

"لیکن یہ پتلون پر دھبے کیسے پڑے۔"

"اس لئے کہ سالن واہیات تھا — مجھ سے دو مرتبہ چاول نیچے گر گئے"

"چاول تو آپ سے ہمیشہ نیچے گرتے رہتے ہیں"

"اس کو چھوڑو — مجھے یہ بتاؤ کہ فرش پر شربت کس نے گرایا تھا اور اور — یہ گلاس — جگ — کوئی مہمان آیا تھا۔"

"ہاں — میری ایک سہیلی آئی تھی۔"

"کون۔"

"آپ اسے نہیں جانتے — کوئٹے کی تھی جو میرے ساتھ پڑھتی تھی اس کی حال ہی میں شادی ہوئی ہے۔ مجھ سے ملنے آئی تھی۔"

"اس سے کیا باتیں ہوئیں —"

"میں آپ کو کیوں بتاؤں — ویسے وہ اپنے خاوند سے بہت خوش تھی۔"

"ہر عورت کو اپنے خاوند سے خوش ہونا چاہیئے — اس میں اس کی کیا برتری ہے۔؟"

"نہیں — وہ —"

"کیا۔"

"وہ بے حد خوش تھی — اس نے مجھے —"

"کیا —"

"ایسی ایسی باتیں سنائیں جو — جو مجھے معلوم ہی نہیں تھیں۔ شائد آپ کو بھی معلوم نہ ہوں۔"

"اس گفتگو کو چھوڑیئے — آیئے میں آپ کے جوتے اتار دوں۔"

"یہ کام میں بھی خود ہی کر سکتا ہوں"

"نہیں میں آج خود کروں گی۔ پہلے ٹائی اتارنے دیجئے۔"

اتار دیجیے۔"

"آپ آج کتنے اچھے لگتے ہیں۔"

"اس کی وجہ کیا ہے — پہلے تو میں تمہیں کبھی اچھا نہیں لگا تھا آج یک بیک انقلاب کیسے پیدا ہو گیا۔"

"انقلاب کیسا — میں شروع ہی سے آپ سے محبت کرتی ہوں۔ میرا سارا دوپٹہ گیلا ہو گیا ہے — تو بہ آپ کو اتنا پسینہ کیوں آ رہا ہے۔"

"چلئے اندر۔"

"چلو۔"

"یہاں باہر کی بہ نسبت گرمی کس قدر کم ہے۔"

"ہاں۔"

"اس تنبو نے تو آپ کی انگلیوں پر چپڑیاں ڈال دی ہیں"

"ہر تنگ چیز راحت کا باعث ہوتی ہے۔"

"میں بھی آج سے تنگ ہو گئی ہوں"

"مجھ سے۔"

"نہیں — میری سہیلی نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا خاوند — خیر آپ اس قصہ کو چھوڑیئے — اس نے بڑی تنگ اور چست چولی پہنی ہوئی تھی۔"

"میں نے اب دیکھا ہے کہ تم بھی اسی قسم کا بلاؤز پہنے ہو — کہاں سے لیا تم نے —"

"آج ہی اس کے درزی سے سلوایا ہے"

"اور میں جو ساڑھی لایا ہوں ــــ"

"وہ اس سے میچ نہیں کرتی ــــ خیر میں آپ کے ساتھ چلوں گی اور اس دوکان میں کوئی اور ساڑھی پسند کر لوں گی ــــ"

"اس سہیلی نے تم سے کیا باتیں کیں ــــ"

"آپ لیٹ جائیے ــــ پھر آپ کو پسینہ آرہا ہے ــــ میں آپ کو اس کی تمام باتیں سنا دوں گی ــــ"

"تم اپنی سہیلی سے ایسی باتیں ہر روز سنا کرو ــــ تاکہ ہماری زندگی خوشگوار رہے اور تم میرے پسینے کو اپنے دوپٹے سے اسی طرح پونچھتی رہو۔

"آپ کا پسینہ تو اب میرا لہو بن گیا ہے۔

# گھوگا

میں جب ہسپتال میں داخل ہوا تو چھٹے روز میری حالت بہت غیر ہو گئی کئی روز تک بیہوش رہا ــــ ڈاکٹر جواب دے چکے تھے لیکن خدا نے اپنا کرم کیا اور میری طبیعت سنبھلنے لگی۔

اس دوران کی مجھے اکثر باتیں یاد نہیں دن میں کئی آدمی ملنے کے لئے آتے لیکن مجھے قطعاً معلوم نہیں کون آتا ہے ــــ کون جاتا تھا۔ میرے بستر مرگ پر جیسا کہ مجھے اب معلوم ہوا دوستوں اور عزیزوں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ بعض روتے، بعض آہیں بھرتے۔ میری زندگی کے بیتے ہوئے واقعات دہراتے اور افسوس کا اظہار کرتے ــــ

جب میری طبیعت کسی قدر سنبھلی اور مجھے ذرا ہوش آیا تو میں نے آہستہ آہستہ اپنے گرد و پیش کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ میں جنرل وارڈ میں تھا دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ کا پہلا بیڈ میرا تھا۔ دیوار کے ساتھ لوہے کی الماری تھی جس میں خاص خاص دوائیں اور آلاتِ جراحی تھے دیگر سامان

بھی تھا۔ مثلاً گرم پانی اور برف کی ربڑ کی تھیلیاں، تھرمامیٹر بستر کی چادریں کمبل اور روئی وغیرہ اس کے علاوہ اور بے شمار چیزیں تھیں جن کا مصرف میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

کئی نرسیں تھیں ــــ صبح سات بجے سے دو بجے دوپہر تک دو بجے سے شام کے سات بجے تک چار چار نرسوں کی ٹولی اس وارڈ میں کام کرتی رات کو صرف ایک نرس ڈیوٹی پر ہوتی تھی۔

رات کو مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ یوں تو اکثر آنکھیں بند کئے لیٹا رہتا لیکن کبھی کبھی نیم مندی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ لیتا کہ کیا ہو رہا ہے ان دنوں جو نرس رات کی ڈیوٹی پر ہوتی تھی۔ نہ اس قدر مختصر تھی کہ اسے کوئی بھی اپنے جوڑے میں ڈال سکتا تھا۔ گہرا سانولا رنگ ہر عضو ایک خلاصہ ــــ ہر خدوخال تمہید کی فوری تمت ــــ انتہا درجے کی غیر نسوانی لڑکی تھی ــــ معلوم نہیں قدرت کے ساتھ اس قسم کا غیر شاعرانہ سلوک کیوں کیا تھا۔ کہ وہ شعر تھی نہ رباعی ــــ نہ قطعہ البتہ استاد امام الدین کی تک بندی معلوم ہوتی تھی۔

ہر نرس کا کوئی نہ کوئی چاہنے والا موجود تھا۔ مگر اس غریب کا کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نرسنگ کے پیشے کو باوجود اس کی موجودہ گراوٹوں کے احترام کی نظر سے دیکھتا ہوں اس لئے مجھے اس نرس سے جس کا نام مس جیکب تھا۔ بڑی ہمدردی تھی۔ اس سے کوئی مریض دلچسپی نہیں لیتا تھا۔

ایک شام کو جب وہ آئی اور میرے بستر کے پاس سے گزری تو میں نے اپنی نحیف آواز میں اس سے کہا۔

"اسلام وعلیکم مس جیکب ـــ" اس نے میری آواز سن لی فوراً رک کر اس نے جواب دیا۔ سلاما الیکم ـــ"

بس اس کے بعد میرا یہ دستور ہوگیا کہ جب وہ شام کو ڈیوٹی پہ آتی تو وارڈ میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس کو میری اسلام علیکم سنائی دیتی مجھے نیند آنا شروع ہو گئی تھی لیکن صبح ساڑھے پانچ بجے جاگ جاتا مس جیکب رات بھر کی جاگی ہوئی مریضوں کے ٹمپریچر لینے میں مصروف ہوتی جب میرے بستر کے پاس آتی تو میں پھر اسے سلام کرتا۔

اسلام وعلیکم کا یہ سلسلہ بڑا دلچسپ ہوگیا ـــ وہ اس لحاظ سے چڑ گئی کہ پہل میں کیوں کرتا ہوں چنانچہ اس نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ وہ مجھ سے سبقت لے جائے مگر اسے ناکامی ہوئی۔ لیکن ایک روز صبح سویرے جبکہ زیادہ دیر تک جاگنے کے باعث میری آنکھ لگ گئی تھی۔ جب وہ میرا ٹمپریچر لینے کے لئے آئی تو اس نے اپنی مہین پتلی آواز کو زوردار بنا کر کہا۔

سلاما لیکم ـــ"

میں چونک پڑا ـــ آنکھیں کھولیں ـــ تو دیکھا کہ مس جیکب کا مختصر وجود میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا ہے۔ میں نے بڑی فراخدلی سے اپنی شکست تسلیم کی اور اس کے مطابق مناسب وموزوں مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر پیدا

کرکے جواب دیا وعلیکم السلام مس جیکب آج تو آپ نے کمال کر دیا۔
وہ بیحد خوش ہوئی ——— چنانچہ اس خوشی میں اس نے میرا دو مرتبہ ٹمپریچر
لیا کہ پہلی دفعہ اس نے تھرما میٹر ابھی طرح جھٹکا نہیں تھا۔

ایک رات جبکہ مجھے بالکل نیند نہیں آرہی تھی اور میں بار بار اپنی گھڑی
دیکھ رہا تھا کہ دن ہونے میں کتنی دیر ہے بارہ بجے کے قریب میں نے اپنی دھندلی
آنکھوں سے دیکھا کہ میز کے وسط میں جو میز پڑا ہے اس کے ساتھ کرسی پر
مس جیکب اپنے تمام اختصار کے ساتھ بیٹھی ہے اور ایک مریض جو موٹا تھا اس
سے ہمکلام ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔

چونکہ خاموشی تھی۔ اس لیے میں اس کی گفتگو سن سکتا تھا۔ وہ نرس
سے بڑے یتیمانہ قسم کے عشق کا اظہار کرنے کی سعی کر رہا تھا پہلے وہ کچھ دیر
چپڑاسیوں کی مانند جن کا صاحب اپنی مسند پر موجود تھا کھڑا رہا پھر وہ
اس سے مخاطب ہوا ——— نرس صاحبہ ——— "کیا اس وقت آپ مجھے اسپرین
کی گولی دے سکتی ہیں۔"

مس جیکب غالباً رپورٹ لکھنے میں مصروف تھی۔ اس موٹے مریض کی
طرف دیکھا ——— قلم میز پر رکھ کر اٹھی اور اس الماری میں سے جو میرے بستر
کے قریب تھی۔ اسپرین کی ایک گولی نکال کر اس کے حوالے کر دی۔

رات کے دو بج گئے۔ میں جاگ رہا تھا ——— لیکن میری آنکھیں بند تھیں جب
آہٹ ہوئی تو میں نے کروٹ بدل کر دیکھا کہ وہی موٹا مریض الماری کھول کر اسپرین

کی گولیاں نکال رہا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے کوئی چور چوری کر رہا ہے نیں نے کوئی مداخلت نہ کی۔

میں نے دوسرے دن نرس نغمہ حق سے جو ہر صبح میرا بدن چھوٹے چھوٹے تولیوں سے کنکنے پانی میں صابن کے ساتھ صاف کیا کرتی تھی اور پرلے درجے کی شریر تھی۔ پوچھا کہ انیس نمبر کے بیڈ کا مریض کون ہے؟

اس کا سانولا چہرہ سوال بن گیا ـــــ آپ اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں۔؟"

میں نے اس سے کہا۔" تم جانتی ہو کہ میں افسانہ نگار ہوں مجھے ہر شخص سے دلچسپی ہے خواہ وہ مریض ہی کیوں نہ ہو۔

" اس میں کیا بات ہے؟"

"جو تم میں ہے ـــ تم شریر ہو ـــ وہ چور ہے"

نغمہ حق کو میری یہ بات ناگوار معلوم ہوئی ـــ " شرارت اور چوری کو آپ ایک ہی بات سمجھتے ہیں"

وہ میرے بالوں بھرے سینے پر تولیہ پھیر رہی تھی میں نے اپنے کمزور ہاتھ سے اس کے گال پر ہولے سے چپت لگائی۔ اور کہا۔

" میرا یہ مطلب نہیں تھا ـــ تم میرے سوال کا جواب، دو کہ انیس نمبر کے بیڈ کا جو مریض ہے۔ اس کا کیا نام ہے۔؟

نغمہ نے جواب دیا۔ گھوگا۔"

"یہ کیا نام ہے ؟"

"بس ہے۔ ہم نے رکھ دیا ہے۔"

میں اس سے کچھ اور پوچھنے ہی والا تھا کہ نعیمہ نے ابالی ہوئی سرنج پکڑی اور اس میں ایک سی سی وٹامن بی کمپلکس ڈال کر سوئی میرے سوکھے ہوئے بازو میں کھبو دی۔ مجھے سخت درد ہوا اس لئے میں گھوگا کو بھول گیا مگر اتنے میں عذرا آ گئی ــــ یہ نرس نعیمہ سے چار سی سی آگے تھی ان دونوں میں جو گفتگو ہوتی اس سے مجھے معلوم ہوا کہ انیس نمبر کے بیڈ کا مریض ان دونوں نے مل کر تجویز کیا ہے۔

عذرا نے پہلے میری خیریت پوچھی ــــ پھر کہا۔ "خیریت تو ہے آپ گھوگے کے متعلق پوچھ رہے تھے۔"

میں نے درد کے باعث ذرا تلخ لہجے میں کہا۔ "گھوگا جائے جہنم میں۔ اور تم بھی اس کے ساتھ ــــ"

عذرا مسکرائی ــــ "میں تو اس کے ساتھ جہنم کی آخری حد تک جانے کے لئے تیار ہوں ــــ"

نعیمہ نے پوچھا۔ "کیوں۔؟"

عذرا نے جواب دیا۔ "وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔"

نعیمہ نے عذرا کے چٹکی لی اور بڑے زور سے کہا۔ "وہ تو مجھ سے محبت کرتا

ہے۔ چلو آؤ —— ابھی فیصلہ کر لیں۔ گھوگا سے پوچھ لو —— ابھی کل ہی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے دو مکان میرے نام لکھدے گا۔"

عذرا نے مکھی مار چھڑی نعیمہ نے سر پر ماری ——" وہ دو مکان کیا دو اینٹیں بھی تمہارے نام نہیں لکھے گا۔ وہ گھوگا ہے —— بہت بڑا گھوگا۔ تم اس کو ابھی تک نہیں پہچانی ہو۔"

اس کے بعد مجھے چند روز میں اس موٹے مریض کے متعلق عجیب و غریب باتیں معلوم ہوئیں جس کو نعیمہ اور عذرا نے گھوگے کا نام دے رکھا تھا۔

اس کا نام غلام محمد تھا۔ ماسٹر غلام محمد بی اے بی ٹی کسی مڈل سکول کا ہیڈ ماسٹر —— اس کو دمے کا مرض تھا بڑی شدید قسم کا دمہ تھا جب اسے دورہ پڑتا تو سارا وارڈ اس کے دھونکنی ایسے چلتے ہوئے سانسوں کے زیر و بم سے گھنٹوں گونجتا رہتا لیکن اس حالت میں بھی وہ نظر بازی سے نہ ٹلتا۔

اس کی عمر چالیس سے کچھ اوپر ہوگی —— مگر کنوارہ تھا۔ میری اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے بتایا کہ اس نے شادی اس لئے نہیں کی کہ وہ دمے کا مریض ہے۔ کسی لڑکی کی زندگی کیوں خراب کرے۔

اس کی دو بہنیں تھیں جو عمر میں اس سے کچھ چھوٹی تھیں یہ بھی کنواری تھیں ان کے متعلق مجھے صرف اتنا ہی معلوم ہوا ہے کہ بڑی ہیلتھ وزیٹر ہے اور چھوٹی استانی۔ یہ دونوں بلاناغہ آتیں اور گھوگے کے پاس اپنے برقعوں سمیت ایک آدھ گھنٹہ بیٹھ کر واپس چلی جاتیں وہ اس کے ناشتے اور دو وقت کے

کھانے کے لئے پراٹھے اور سالن وغیرہ لایا کرتی تھیں۔

اس کو ایسے ٹیکے لگ رہے تھے۔ جن سے اشتہا بڑھ جاتی ہے لیکن اس بات کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے کہ مریض زیادہ نہ کھائے تاکہ اس کا وزن نہ بڑھے مگر گھوگا بلا خور تھا گھر سے جو کچھ آتا چٹ کر جاتا پھر اس کے ساتھ والے بیڈ پر بنگالی نوجوان تھا جو عرصے سے ٹائیفائیڈ میں گرفتار تھا اس کو بھوک نہیں لگتی تھی گھوگا اس کا کھانا بھی اپنے پیٹ میں ڈال لیتا۔ مگر نعیمہ نے مجھے بتایا کہ ہسپتال سے جو اسے مفت کھانا ملتا ہے اس کے علاوہ وہ ادھر ادھر سے اور اکھٹا کرتا ہے اور اپنی بہنوں کے حوالے کر دیتا ہے۔

ایک رات جبکہ مجھے نیند آنے ہی والی تھی میں نے دیکھا کہ گھوگا دبے پاؤں چلا آرہا ہے ـــــ رات کی نرس کسی دوسرے وارڈ کی نرس سے باتیں کرنے میں مشغول تھی۔ گھوگے نے الماری کھولی اور اس میں کئی چیزیں نکال کر اپنی جیب میں ڈال لیں ـــــ مجھے اس کی یہ حرکت بہت بری معلوم ہوئی لیکن اسے میں کچھ نہ کہہ سکا اس لئے کہ مجھے کوئی فیصلہ کرنے میں دیر ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہر روز الماری میں سے چیزیں چراتا اور میں اسے ٹوک نہ سکتا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ جب اسے دوائیں برابر ملتی ہیں تو وہ اور دوائیاں جو اس کے مرض دمے کا علاج نہیں تھیں کیوں اس طریقے سے حاصل کرتا ہے۔

نعیمہ حق سے میں نے پوچھا تو اس نے مخصوص انداز میں گردن کو ایک خفیف سی جنبش دے کر اور اپنے سانولے ہونٹوں پر ان سے زیادہ گہرے رنگ کی مسکراہٹ پیدا کر کے کہا۔

"جناب اتنے بڑے رائیٹر بنے پھرتے ہیں آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ قیمتی دوائیاں اور انجکشن چراتا ہے۔ اپنی بہن کو جو کہ ہیلتھ وزیٹر ہے دے دیتا ہے۔ اس کو روزانہ بیڈ کے لئے ایک روپیہ دینا پڑتا ہے ـــ بہت بڑا ٹھگ ہے اس لئے وہ اس خرچ کی کسر پوری کر لیتا ہے بلکہ اس کو کچھ پرافٹ ہی ہوتا ہے۔"

نعیمہ کا یہ کہنا درست ہے اس لئے کہ میری بیوی کے بیان سے اس کی تصدیق ہو گئی اس کو گھوگے سے سخت نفرت تھی۔ ہسپتال سے جو کچھ ملتا تو وہ اپنی بہن کے سپرد کر دیتا ـــ کھانا بھی ـــ ایک اور نرس رفیقہ تھی وہ اس مریض کا نام بھی لینا نہیں چاہتی تھی۔

شکل وصورت کی معمولی مگر نوجوان تھی ہر وقت اپنے سفید فراک کو پیٹی کے نیچے کھینچتی اور پھر اپنے سینے کے ابھاروں کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتی مگر کردار کے لحاظ سے وہ دوسری نرسوں کے مقابلے میں بہت مضبوط تھی۔ اس کو گھوگے سے اس لئے نفرت تھی کہ وہ اس سے بے معنی باتیں کرتا تھا۔

دراصل وہ ہر نرس سے بے معنی یا بامعنی باتیں کرنے کا عادی تھا۔ میں

میں نے کئی بار دیکھا کہ پہلے اس نے کسی نرس سے رسمی بات چیت کی اس کے بعد بستر پر سے اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ کچھ اس بھونڈے طور پر کہ وہ غریب اکتا گئی اور اس نے جو دوا مانگی الماری میں سے نکال کر اس کو دے دی کہ چھٹکارا ملے۔

تریب قریب ہر نرس اس سے متنفر تھی ــــ مجھے خود وہ بہت ناپسند تھا ــــ میرے بستر کی طرف رخ کرتا تو میں چادر اوڑھ لیتا تاکہ اس کو یہ معلوم ہو کہ میں سو رہا ہوں۔ اس کا بات چیت کا انداز مجھے کھلتا تھا یہی وجہ ہے کہ میں نے اسے کبھی برداشت نہ کیا۔

مجھ سے دو تین مرتبہ اس نے چند روپے بطور قرض لیے اور واپس نہ دیئے مجھے اس کا کوئی خیال نہ تھا لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ پندرہ روپے اس نے مجھ سے اس لیے حاصل کیے تھے۔ کہ اس کو دس روپے ایک خاص دوا کے لیے خرچ کرنا پڑے تھے۔ جو ہسپتال میں نہیں تھی۔ تو میری طبیعت بہت مکدر ہوئی اور میں نے دل ہی دل میں اس کو سینکڑوں گالیاں دیں۔ پھر تمام ڈاکٹروں پر اس کے ذلیل کردار کی وضاحت کر دی۔

وہ پہلے میری بتائی ہوئی باتیں نہ مانے انہوں نے کبھی ایسا مریض دیکھا تھا نہ سنا ــــ مگر نرسوں سے پوچھ گچھ کے بعد ان کو حقیقت معلوم ہو گئی اور انہوں نے گھوگے کو رخصت کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے اس کا علم تھا چنانچہ میں نے محض اپنا دل ٹھنڈا کرنے کی خاطر اس کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔

"سنا ہے آپ کل پرسوں جانے والے ہیں۔"

گھوگے نے اپنے نیم گنجے سر پر ہاتھ پھیرا اور تعجب کا اظہار کیا۔

"بڑے ڈاکٹر صاحب نے تو مجھ سے کہا تھا کہ اور چھٹی لو — اور میں ایک مہینے کی لے چکا ہوں —"

میرا دل ڈوبنے سا لگا۔ ایک مہینہ اور — تیس دن مزید چوریوں کے — نرسوں کے پیچھے چلنے اور ہاتھ مل مل کے دوائیں مانگنے کے۔

بڑے ڈاکٹر صاحب بہت نرم دل تھے۔ میں نے سوچا یقیناً گھوگے نے اپنے مخصوص لسوڑے کی لیس ایسے انداز میں ان کی منت سماجت کی ہوگی اور انہوں نے اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے اس کو ایک ماہ اور ہسپتال میں رہنے کی اجازت دے دی ہوگی۔ مگر اسی دن گھوگا انتہائی افسردگی کے عالم میں میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"میں کل جا رہا ہوں۔"

"مجھے بڑی خوشی ہوئی — مگر ماسٹر صاحب آپ نے تو ایک مہینے کی چھٹی لی ہے۔ ابھی ابھی۔"

اس نے آہ بھر کر جواب دیا "ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ تمہارا کافی علاج ہو چکا ہے۔ اب تم گھر میں آرام کرو —"

"میں نے کہا۔ یہ بہتر ہے۔"

لیکن گھوگے کا چہرہ بتا رہا تھا۔ کہ گھر میں اسے چرانے کے لئے دوائیں

نہیں ملیں گی۔ نرسیں بھی نہ ہوں گی۔۔۔ جھک مارے گا وہاں۔

میں صبح چار ساڑھے چار بجے کے قریب سویا۔ دس بجے آنکھ کھلی۔ نعیمہ حق میرے پاس کھڑی تھی دراصل اسی نے مجھے جگایا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھے کوئی خبر سنانا چاہتی ہے مجھے زیادہ دیر تک انتظار نہ کرنا پڑا۔

مکھی مار چھڑی سے میری بستر پر چند نیز مری مکھیاں مارنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔

" گھوگا گیا۔

میں نے کہا۔

" ہاں سنا تھا۔ کہ وہ جا رہا ہے۔۔"

نعیمہ کے سانولے ہونٹوں پر سکڑی ہوئی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔۔۔ اور وہ بھی گئی۔

" میں نے پوچھا۔۔۔ " کون۔"

نعیمہ نے جواب دیا۔۔۔ " وہ۔۔۔ وہ مس جیکب۔۔۔ جس کے متعلق آپ کہا کرتے تھے۔۔۔ کہ اتنی مختصر ہے کہ بٹوے میں سما سکتی ہے۔ لیکن گھوگے کے پاس تو کوئی بٹوہ نہیں تھا۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ کہ مس جیکب کو گھوگے میں کیا نظر آیا یا گھوگے کو مس جیکب میں کیا خوبی دکھائی دی۔۔۔ لیکن میترے رونہ مس جیکب نائٹ ڈیوٹی

پڑھتی۔ جب وہ صبح میرے بستر کے قریب آئی تو میں نے روز سے السلام علیکم کہا اس نے چونک کر دھیمی آواز میں اس سلام کا جواب دیا اور میرا میٹر پکڑے بغیر چلی گئی

سات بجے جب دوسری تر سیس آئیں تو نعیمہ نے میرا بدن پونچھنے کے لئے گرم پانی تیار کرتے ہوئے اپنے سانولے ہونٹوں پر کنکنی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا ــــ "گھوگے کے پاس بٹوہ نہیں تھا اس لئے آپ کی مس جیکب واپس تشریف لے آئی ہیں۔"

میں نے پوچھا ــــ "کیا ہوا۔"

نعیمہ نے گرم گرم پانی میں تر کیا ہوا تولیہ میرے بازو پر رکھ دیا۔

"کچھ خاص تو نہیں ہوا ــــ صرف مس جیکب کے کانوں کی دو سونے کی بالیاں گم ہو گئی ہیں ــــ شاید گھوگے کی بہن کے کان بچھے ہوں گے۔"

☘

# بھنگن

"پرے ہٹئے ــــــ"

"کیوں؟"

"مجھے آپ سے بُو آتی ہے۔"

"ہر انسان کے جسم کی ایک خاص بُو ہوتی ہے ــــــ آج بیس برسوں کے بعد تمہیں اس سے تنفر کیوں محسوس ہونے لگا؟"

"بیس برس ــــــ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ میں نے اتنا طویل عرصہ کیسے بسر کیا ہے۔"

"میں نے کبھی آپ کو اس عرصہ میں تکلیف پہنچائی؟"

"جی، کبھی نہیں۔"

"تو پھر آج اچانک آپ کو مجھ سے ایسی بُو کیوں آنے لگی جس سے آپ کی ناک جو ماشاءاللہ کافی بڑی ہے اتنی غضب ناک ہو رہی ہے!"

"آپ اپنی ناک تو دیکھیے —— پکوڑا سی ہے۔"

"میں اس سے انکار نہیں کرتا —— پکوڑے، تم جانتی ہو۔ مجھے بہت پسند ہیں۔"

"آپ کو تو ہر واہیات چیز پسند ہوتی ہے۔ کوڑے کرکٹ سے بھی آپ دلچسپی لیتے ہیں۔"

"کوڑا کرکٹ ہمارا ہی تو پھیلایا ہوتا ہے —— اس سے آدمی دلچسپی کیوں نہ لے —— اور تم جانتی ہو آج سے دس سال پہلے جب تمہاری ہیرے کی انگوٹھی گم ہو گئی تھی تو اسی کوڑے کے ڈھیر سے میں نے تمہیں تلاش کر کے دی تھی۔"

"بڑا کرم کیا تھا آپ نے مجھ پر؟"

"بھئی کرم کا سوال نہیں —— فارسی کا ایک شعر ہے ؎

خاکساراں را بہ حقارت منگر

تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

"میں خاک بھی نہیں سمجھی۔"

"یہی وجہ ہے کہ تم نے ابھی تک مجھے نہیں سمجھا —— ورنہ بیس برس ایک آدمی کو پہچاننے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔"

"ان بیس برسوں میں آپ نے کون سا سکھ پہنچایا ہے مجھے؟"

"تم دکھ کی بات کرو —— بتاؤ میں نے کون سا دکھ تمہیں اس عرصے میں پہنچایا؟"

"ایک بھی نہیں۔"

"تو پھر یہ کہنے کا کیا مطلب تھا — ان بیس برسوں میں آپ نے کون سا سکھ پہنچایا ہے مجھے؟"

"آپ میرے قریب نہ آئیے — میں سونا چاہتی ہوں"

"اس غصے میں نیند آ جائے گی تمہیں؟"

"خاک آئے گی — بہرحال — آنکھیں بند کر کے لیٹی رہوں گی اور...."

"اور کیا کریں گی؟"

"لیٹی اس روز پر آنسو بہاؤں گی جب میں آپ کے پلے بندھی گئی"

"تمہیں یاد ہے وہ دن کیا تھا — سن کیا تھا — وقت کیا تھا؟"

"میں کبھی وہ دن بھول سکتی ہوں — خدا کرے وہ کسی لڑکی پر نہ آئے"

"تم بتاتو دو — میں تمہاری یادداشت کا امتحان لینا چاہتا ہوں۔"

"اب آپ میرا امتحان کیا لیں گے — پرے ہٹئے — مجھے آپ سے بو آ رہی ہے"

"کبھی حد ہو گئی ہے — تمہاری اتنی لمبی ناک جو کہیں ختم ہونے ہی میں نہیں آتی اس کو آخر کیا ہو گیا ہے — مجھ سے تو اس کو بڑی بھینی بھینی خوشبو آنا چاہیئے — تم نے مجھ سے ان بیس برسوں میں ہزاروں مرتبہ کہا کہ آپ جب کسی کمرے میں داخل ہوں اور وہاں سے نکل جائیں تو میں پہچان جایا کرتی ہوں کہ آپ وہاں آئے تھے!

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"دیکھو ——— میں نے اپنی زندگی میں آج تک جھوٹ نہیں بولا ——— تم مجھ پر یہ الزام نہ دھرو۔"

"واہ جی واہ، بڑے آئے ہیں آپ کہیں کے سچے ——— میرا سو روپے کا نوٹ آپ نے چرایا اور صاف مُکر گئے۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"دو جون سن انیس سو بیالیس کو ——— جب سلمیٰ میرے پیٹ میں تھی۔"

"یہ تاریخ تمہیں خوب یاد رہی۔"

"کیوں یاد نہ رہتی۔ جب آپ سے میری اتنی زبردست لڑائی ہوئی تھی۔ میں اندر کمرے میں پڑی تھی۔ آپ نے چابی بڑی صفائی سے میرے تکیے کے نیچے سے نکالی۔ دوسرے کمرے میں جا کر الماری کھولی اور اس میں جو سات سو پڑے تھے ان میں سے ایک نوٹ اڑا کر لے گئے۔ میں نے جب دو ڈھائی گھنٹوں کے بعد اٹھ کر دیکھا تو آپ سے بہت چخ ہوئی۔ مگر آپ تھے کہ پروں پر پانی ہی نہیں لیتے تھے۔ آخر میں خاموش ہو گئی۔"

"یہ دو جون سن انیس سو بیالیس کی بات ہے ——— آج کل سن چھپّن چل رہا ہے۔ اب اس کے ذکر کا کیا فائدہ؟"

"فائدہ تو ہر حالت میں آپ ہی کا رہتا ہے ——— میری ایک نیلم کی انگوٹھی بھی آپ نے غائب کر دی تھی، لیکن میں نے آپ سے کچھ نہیں کہا تھا۔"

"دیکھو میں تمہاری جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ اس نیلم کی انگوٹھی کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں ——"

"اور اس سو روپے کے نوٹ کے متعلق؟"

"اب تمہاری جان کی قسم کھائی ہے تو سچ سچ بتانا ہی پڑے گا۔ میں نے —— چرایا ضرور تھا، مگر صرف اس لئے کہ اس مہینے مجھے تنخواہ دیر سے ملنے والی تھی اور تمہاری سالگرہ تھی، تمہیں کوئی تحفہ تو دینا تھا۔ ان بیس برسوں میں تمہاری ہر سالگرہ پر میں اپنی استطاعت کے مطابق کوئی نہ کوئی تحفہ پیش کرتا رہا ہوں۔"

"بڑے تحفے تحائف دئے ہیں آپ نے مجھے۔"

"ناشکری تو نہ بنو۔"

"میں کئی دفعہ کہہ چکی ہوں، آپ پرے ہٹ جائیے —— مجھے آپ سے بُو آتی ہے۔"

"کس کی؟"

"یہ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے۔"

"میں نے خود کو کئی مرتبہ سونگھا ہے، مگر میری پکوڑا جیسی ناک میں ایسی کوئی بُو نہیں گھسی جس پر کسی بیوی کو اعتراض ہو سکے۔"

"آپ باتیں بنانا خوب جانتے ہیں۔"

"اور باتیں بگاڑنا تم —— میری سمجھ میں نہیں آتا آج تم اس قدر ناراض کیوں ہو؟"

"اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھئے۔"

"میں اس وقت قمیص پہنے نہیں ہوں۔"

"کیوں؟"

"سخت گرمی ہے۔"

"سخت گرمی یا نرم ——— آپ کو قمیص تو نہیں اتارنا چاہیئے تھی۔ یہ کوئی شرافت نہیں۔"

"محترمہ! آپ نے بھی تو قمیص اتار رکھی ہے ——— اپنے ننگے بدن کو ملاحظہ فرمائیے۔"

"اوہ ——— یہ میں نے کیا واہیات پن کیا ہے۔"

"یہ واہیات پن تو آپ گرمیوں میں بیس برس سے کر رہی ہیں۔"

"آپ جھوٹ بولتے ہیں۔"

"خیر جھوٹ بولنا تو ہر مرد کی عادت ہوتی ہے۔"

"آپ مجھ سے دور ہی رہیں۔"

"کیوں؟"

"توبہ ——— لاکھ بار کہہ چکی ہوں کہ مجھے آپ سے بہت گندی بُو آرہی ہے۔"

"پہلے صرف بُو تھی ——— اب گندی ہو گئی۔"

"خبردار، جو آپ نے مجھے ہاتھ لگایا۔"

"اس قدر بیزاری آخر کیوں ہے؟"

"میں اب آپ سے قطعاً بیزار ہو چکی ہوں۔"

"ان بیس برسوں میں تم نے کبھی ایسی بیزاری کا اظہار نہیں کیا تھا۔"

"اب تو کر دیا ہے۔"

"لیکن مجھے معلوم تو ہو کہ اس کی وجہ کیا ہے۔"

"میں کہتی ہوں، مجھے مت چھوئیے۔"

"تمہیں مجھ سے اتنی کراہیت کیوں ہو رہی ہے؟"

"آپ ناپاک ہیں ——— بے حد ذلیل ہیں۔"

"دیکھو، تم بہت زیادتی کر رہی ہو۔"

"آپ نے کم کی ہے۔ کوئی شریف آدمی آپ کی طرح ایسی ذلیل حرکت نہیں کر سکتا تھا۔"

"کون سی ہے؟"

"آج صبح کیا ہوا تھا؟"

"آج صبح؟ ——— بارش ہوئی تھی۔"

"بارش ہوئی تھی ——— لیکن اس بارش میں آپ نے کس کو اپنی آغوش میں دبایا ہوا تھا؟"

"اوہ!"

"بس اس کا جواب اب "اوہ" ہی ہوگا ——— میں نے پکڑ لیا آپ کو۔"

"دیکھو میری جان ———"

"مجھے جان وان مت کہیے ——— آپ کو شرم آنی چاہئے۔"

"کس بات پر ——— کس گناہ پر؟"

"میں کہتی ہوں آدمی گناہ کرے ——— لیکن ایسی گندگی میں نہ گرے۔"

"میں کس گندگی میں گرا ہوں؟"

"آج صبح آپ نے اس ——— اس . . . . ."

"کیا؟"

"اس بھنگن کو ——— جوان بھنگن کو جو مٹھائی والے کے ساتھ بھاگ گئی تھی"

"لاحول ولا ——— تم بھی عجیب عورت ہو ——— "غریب حاملہ سے بارش میں جھاڑو دیتے ہوئے اس کو غش آیا اور گر پڑی۔ میں نے اس کو اٹھایا اور اس کے کوارٹر میں لے گیا۔"

پھر کیا ہوا؟"

"تمہیں معلوم نہیں کہ وہ مر گئی؟"

"ہائے ——— بے چاری ——— میں تو ٹھنڈی برف ہو گئی ہوں۔"

"میرے قریب آجاؤ ———"

"میں قمیص پہنے ہوئے ہوں؟"

"اس کی کیا ضرورت ہے؟ تمہاری قمیص میں ہوں"

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیان اپنا

# نُور جہاں سرورِ جاں

میں نے شاید پہلی مرتبہ نورجہاں کو فلم "خاندان" میں دیکھا تھا۔ اس زمانے میں وہ بے بی تھی۔ حالانکہ پردے پر وہ ہرگز ہرگز اس قسم کی چیز معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کے جسم میں وہ تمام خطوط، وہ تمام قوسیں موجود تھیں جو ایک جوان لڑکی کے جسم میں ہوسکتی ہیں۔ اور جن کی وہ بوقتِ ضرورت نمائش کرسکتی ہے۔

'نورجہاں' ان دنوں فلم بین لوگوں کے لیے ایک فتنہ تھی، قیامت تھی۔ لیکن مجھے اس کی شکل و صورت میں ایسی کوئی چیز نظر نہ آئی، ایک فقط اس کی آواز قیامت خیز تھی۔ سہگل کے بعد، مَیں نورجہاں کے گلے سے متاثر ہوا۔ اتنی صاف و شفاف آواز، مُرکیاں اتنی واضح کھرج اتنا ہموار، پنچم اتنا نوکیلا! ۔ مَیں نے سوچا، اگر یہ لڑکی چاہے تو گھنٹوں ایک سُر پہ کھڑی رہ سکتی ہے، اسی طرح، جس طرح بازی گر تنے ہوئے رسّہ پہ بغیر کسی لغزش کے کھڑے رہتے ہیں۔

نورجہاں کی آواز میں اب وہ لوچ، وہ رس، وہ بچپنا اور وہ معصومیت نہیں رہی، جو اس کے گلے کی امتیازی خصوصیّت تھی۔ لیکن پھر بھی نورجہاں، نورِجہاں ہے۔ گو لتا منگیشکر کی آواز

کا جادو آجکل ہر جگہ چل رہا ہے۔ اگر کبھی نور جہاں کی آواز فضا میں بلند ہو۔ تو کان اس سے بے اعتنائی نہیں برت سکتے۔

نور جہاں کے متعلق بہت کم آدمی جانتے ہیں کہ وہ راگ ودّیا اتنا ہی جانتی ہے جتنا کہ کوئی استاد۔ وہ ٹھمری گاتی ہے، خیال گاتی ہے۔ دھرپد گاتی ہے۔ اور ایسا گاتی ہے کہ گانے کا حق ادا کرتی ہے۔ موسیقی کی تعلیم تو اُس نے یقیناً حاصل کی تھی کہ وہ ایسے گھرانے میں پیدا ہوئی، جہاں کا ماحول ہی ایسا تھا۔ لیکن ایک چیز خداداد بھی ہوتی ہے۔ موسیقی کے علم سے کسی کا سینہ معمور ہو، مگر گلے میں رس نہ ہو تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ خالی خولی علم سننے والوں پر کیا اثر کر سکے گا۔

نور جہاں کے پاس علم بھی تھا اور وہ خداداد چیز بھی کہ جسے گلا کہتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں مل جائیں تو قیامت کا برپا ہونا لازمی ہے۔

میں یہاں آپ کے لیے ایک دلچسپ بات بتاؤں کہ وہ لوگ جن پہ خدا کی مہربانی ہوتی ہے، وہ اس سے ناجائز فائدہ بھی اُٹھاتے ہیں۔ میرا مطلب ابھی آپ پر واضح ہو جائے گا۔

چاہیئے تو یہ کہ جو چیز خدا نے عطا کی ہو، اس کی حفاظت کی جائے۔ تاکہ وہ مسخ نہ ہو۔ لیکن میں نے اکثر دیکھا ہے کہ لوگ ان کی پروا نہیں کرتے۔ بلکہ غیر شعوری یا شعوری طور پر پوری

کوشش کرتے ہیں کہ وہ تباہ و برباد ہو جائے۔

شراب گلے کے لیے سخت غیر مفید ہے۔ لیکن سہگل مرحوم ساری عمر بلانوشی کرتے رہے۔ کھٹی اور تیل کی چیزیں گلے کے لیے تباہ کُن ہیں۔ یہ کون نہیں جانتا؟ مگر نورجہاں پاؤ پاؤ بھر تیل کا اچار کھا جاتی ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ، جب اُسے فلم کے لیے گانا ہوتا ہے تو وہ خاص اہتمام سے پاؤ بھر اچار کھائے گی۔ اس کے بعد برف کا پانی پیئے گی۔ پھر مائیکروفون کے پاس جائے گی۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ "اس طرح آواز نکھر جاتی ہے"

یوں آواز کیونکر نکھرتی ہے، گلا کیسے صاف ہوتا ہے، اس کے متعلق نورجہاں ہی بہتر جانتی ہے۔ یوں میں نے اشوک کمار کو بھی برف استعمال کرتے دیکھا ہے۔ کہ جب اُسے گانے کی صدابندی کروانا ہوتی ہے تو وہ سارا وقت برف کے ٹکڑے چباتا رہتا ہے۔

جب تک ریکارڈ زندہ ہیں، سہگل مرحوم کی آواز کبھی نہیں مر سکتی۔ اسی طرح نورجہاں کی آواز بھی ایک عرصے تک زندہ رہے گی۔ اور آنے والی نسلوں کے کانوں میں اپنا شہد ٹپکاتی رہے گی۔

نورجہاں کو میں نے صرف پردے پر دیکھا تھا۔ میں اس کی شکل و صورت اور اداکاری کا نہیں، اُس کی آواز کا شیدائی تھا۔

وہ کم عمر تھی۔ اِس لیے مجھے حیرت تھی کہ وہ کیونکر اتنے دلفریب طریقے سے گا سکتی ہے۔ اُن دنوں دو آدمیوں کا دَور دورہ تھا۔ مرحوم سہگل کا اور نور جہاں کا۔

یوں تو اُن دنوں خورشید چھائی ہوئی تھی، شمشاد کے بھی چرچے تھے مگر نور جہاں کی آواز میں سب کی آواز دب گئی۔

ثریّا بعد کی پیداوار ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ سہگل اور ثریا تو اکٹھے فلم میں پیش ہوئے لیکن نور جہاں اور وہ دونوں الگ الگ رہے۔ معلوم نہیں پروڈیوسروں کے دماغ میں ان دونوں کو یکجا کرنے کا خیال پیدا نہ ہوا۔ یا کسی اور وجہ سے پروڈیوسر ان کو ایک فلم میں کاسٹ نہ کر سکے۔ بہرحال مجھے اس کا افسوس ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اگر وہ دونوں آمنے سامنے ہوتے تو موسیقی کی دنیا میں نہایت خوشگوار انقلاب برپا پیدا ہوتا۔

نور جہاں سے میری پہلی ملاقات کیسے ہوئی، کب ہوئی اور کہاں ہوئی؟! یہ ایک لمبی داستان ہے۔۔۔ میں کئی برس تک بمبئی کی فلمی دنیا میں گزار کر چند وجوہ کی بنا پر دل برداشتہ ہو کر دہلی چلا گیا۔ وہاں پر میں نے آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کر لی۔ مگر یہاں سے بھی دِل اچاٹ ہو گیا۔ بمبئی سے "مصوّر" کے ایڈیٹر نذیر لدھیانوی کے متعدد خطوط آئے کہ تم واپس چلے آؤ۔۔۔! "خاندان" کے ڈائرکٹر شوکت حسین رضوی یہاں آئے ہوئے ہیں

اور میرے ہی پاس ٹھہرے ہیں۔ ان کی یہ خواہش ہے کہ تم اُن کے لیے ایک کہانی لکھو۔

میں دہلی چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے کہ جب کرپس مشن فیل ہو چکا تھا۔ میں غالباً ۷ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی پہنچا۔ شوکت سے میری پہلی ملاقات ۱۷۔اڈلفی چیمبرز کلیئر روڈ پہ ہوئی۔ جو دفتر بھی تھا اور رہائشی مکان بھی۔

بڑا بانکا چھیلا نوجوان تھا۔ گورا رنگ، گالوں پر سرخی، مہین مہین جون گلبرٹ اسٹائل کی مونچھیں، گھنگھریالے بال۔ لمبا قد۔ بہت خوش پوش، بے داغ پتلون، شکنوں سے بے نیاز کوٹ ٹائی کی گرہ نہایت عمدہ۔ چال میں لٹک۔ ہم پہلی ملاقات میں ہی خوب گھل مل گئے۔

میں نے اس کو بہت مخلص انسان پایا۔ میں دہلی سے اپنے ساتھ اپنے پسندیدہ سگریٹ یعنی کریون اے کا کافی سٹاک لے کر آیا تھا۔ جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ اس لیے بمبئی میں یہ سگریٹ قریب قریب نایاب تھے۔ شوکت نے میرے پاس بیس پچیس ڈبے اور پچاس کے قریب ڈبیاں دیکھیں تو بہت خوش ہوا۔

ہم دونوں کا قیام وہیں ۱۷۔اڈلفی چیمبرز میں تھا۔ دو کمرے تھے۔ جہازی سائز کے۔ ایک میں دفتر تھا، دوسرے میں رہائشی معاملہ! مگر رات کو ہم دفتر میں سوتے تھے۔ مرزا مشرف وغیرہ آجاتے تھے

وہ ہماری چارپائیاں بچھا دیتے تھے۔

جب تک شوکت وہاں رہا، بڑے ہنگامے رہے، کریون اے کے سگریٹ اور ناسک کی ہرن مارکہ وسکی جو بڑی واہیات تھی۔ لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ شوکت "خاندان" کے بعد گو بہت بڑا ڈائرکٹر بن گیا تھا۔ مگر لاہور سے بمبئی پہنچنے اور وہاں کچھ دیر رہنے کے دوران میں وہ سب کچھ خرچ ہو چکا تھا۔ جو اس نے لاہور میں فلم کی ہنگامی اور اخراجات سے پُر زندگی گزارنے کے بعد پس انداز کیا تھا ـــ اور میرے پاس تو صرف چند سو تھے جو کہ ہرن مارکہ وسکی میں غرق ہو گئے۔

بہر حال کسی نہ کسی حیلے گزر ہوتا رہا۔ وہ وقت بہت نازک تھا۔ میں سات اگست کو وہاں پہنچا اور ۹ اگست کی صبح کو جب میں نے کہیں ٹیلی فون کرنے کی کوشش کی تو لائن "ڈیڈ" یعنی مردہ تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ کانگریسی لیڈروں کی گرفتاریاں چونکہ عمل میں آرہی تھیں۔ اس لیے احتیاطاً ٹیلی فون کا سارا سلسلہ منقطع کر دیا گیا تھا۔

گاندھی جی، جواہر لعل نہرو اور ابوالکلام آزاد وغیرہ سب گرفتار کر لیے گئے۔ اور کسی نامعلوم جگہ منتقل کر دیئے گئے۔ شہر کی فضا بالکل ایسی تھی جیسے بھری بندوق۔ باہر نکلنے کا تو سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ کئی دن تک ہم ہرن مارکہ شراب پی کر اپنا وقت کاٹتے رہے۔ اس دوران فلم انڈسٹری میں بھی انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ حالات

چونکہ غیر یقینی تھے اس لیے کسی نئے فلم کی تیاری کون کرتا. چنانچہ جن لوگوں سے شوکت کی بات چیت ہو رہی تھی، ایک غیر معینہ عرصے کے لیے کھٹائی میں پڑ گئی، اور ہم نذیر لدھیانوی کے ہاں پکے ہوئے بدمزہ کھانے کھا کر لمبی تان کر سوتے رہے۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھار زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے تھے. اور ہم کہانیوں کے متعلق سوچنا شروع کر دیتے تھے۔

اسی دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ نورجہاں بھی بمبئی میں ہے. لیکن ٹھہریئے! میں آپ کو بتاؤں کہ مجھے کیسے معلوم ہوا۔ میرا حافظہ جواب دے گیا تھا. اصل میں مجھے یہ آٹھ اگست ہی کو معلوم ہو گیا تھا جبکہ میری ملاقات ابھی شوکت سے نہیں ہوئی تھی. مجھے ماہم جا کر اپنے چند رشتہ داروں سے ملنا تھا. اس کے علاوہ مجھے ایک ریڈیو آرٹسٹ ثمینہ کا پتہ لینا تھا. (بعد میں کرشن چندر سے جس کے مراسم رہے)۔ اس لڑکی کو میں نے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے بمبئی بھیجا تھا. کیونکہ اس کو فلم میں کام کرنے کا شوق تھا۔ میں نے اسے پرتھوی راج اور برج موہن کے نام تعارفی خط لکھ کر دے دیئے تھے. اور اب میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آیا وہ فلمی دنیا میں داخل ہو چکی ہے یا نہیں!— لڑکی ذہین تھی، کردار اس کا بہت اچھا تھا۔ مکالمے بہت روانی کے ساتھ ادا کرتی تھی۔ شکل و صورت کی بھی خاصی تھی. اس لیے مجھے یقین

تھا کہ وہ کامیاب ہوگئی ہوگی۔

مجھے پتہ چلا کہ وہ شیواجی پارک میں کہیں رہتی ہے۔ مگر یہ اتنی بڑی جگہ ہے کہ ثمینہ خاتون کا پتہ لگانا بہت مشکل تھا۔ چنانچہ میں نظامی صاحب کے ہاں روانہ ہوگیا جو قریب ہی کیڈل روڈ پر رہتے تھے۔ مجھے ان کا ایڈریس معلوم تھا۔ کہ وہ اکثر مجھے خط لکھتے رہتے تھے۔ یہ وہی نظامی ہیں جنہوں نے ممتاز شانتی کو تربیت دی۔ جن کے پاس ولی صاحب برسوں پڑے رہے اور آخر میں ممتاز شانتی کو نظامی صاحب کے بتائے ہوئے اصولوں کے تحت ہی لے اُڑے۔ یہ وہی نظامی صاحب ہیں جن کی بیوی گیتا نظامی کے نام سے فلمی دنیا میں مشہور ہوئی۔ اور جس نے نظامی صاحب کو لات مار کر پے در پے کئی شادیاں کیں۔ عدالتوں میں جس کے کئی مقدمے چلے اور جو اب ایک نئی خوبصورت لڑکی کے ساتھ ڈانس پارٹی بنا کر شہر بہ شہر پاکستان کا پرچار کر رہے ہیں۔

نظامی صاحب سے میری ملاقاتیں صرف خطوط تک ہی محدود تھیں اور وہ بھی بڑے رسمی سے تھے۔ میں نے ان کو پہلی مرتبہ ان کے فلیٹ پر دیکھا۔ میں اگر اس ملاقات کو بیان کروں تو میرا خیال ہے، دس پندرہ صفحے اس کی نذر ہو جائیں گے۔ اس لیے میں اختصار سے کام لوں گا۔

نظامی صاحب جوکہ دھوتی اور بنیان پہنے تھے۔ مجھے بڑے تپاک سے ملے۔ انھوں نے میرے آنے کا مقصد پوچھا، جو مَیں نے عرض کر دیا۔ آپ نے کہا۔ "ثمینہ خاتون ابھی آپ کے قدموں میں حاضر ہو جائے گی۔"

ان کا ایک مریل قسم کا ہندو مینجر تھا۔ اس کو آپ نے حکم دیا کہ منٹو صاحب کے لیے فوراً ثمینہ خاتون کو حاضر کرو۔ یہ حکم دینے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ اور کہا کہ وہ میرے لیے ہر قسم کی خدمت کے لیے حاضر ہیں۔ چنانچہ انھوں نے فوراً زبانی طور پر میرے لیے ایک عمدہ فلیٹ، بہترین فرنیچر اور ایک عدد کار کا بندوبست کر دیا۔

ظاہر ہے کہ میں بہت خوش ہوا۔ چنانچہ میں نے مناسب اور موزوں الفاظ میں ان کا شکریہ ادا کیا۔ جس کی ان کو بالکل ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے کہ وہ میرے افسانوں کے گرویدہ تھے۔ قارئین سے مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ نظامی صاحب زبانی جمع خرچ کے بادشاہ ہیں۔

نظامی کچھ بھی ہو، لوگ اسے بھڑوا کہیں، کنجر کہتے ہیں۔ کچھ بھی ہو۔ مجھے اس کا حدود اربعہ معلوم نہیں۔ لیکن میرا مطالعہ یہ کہتا ہے کہ وہ ایک مہم جُو انسان ہے۔ وہ اپنے فن میں پوری پوری مہارت رکھتا ہے۔ میں نے اس روز، یعنی پہلی ملاقات کے دن ہی دیکھا

ممتاز شانتی پر اس کا اتنا رعب داب تھا کہ کسی باپ کا بھی نہیں ہو سکتا۔ اور ولی صاحب اس کے سامنے یوں جھکتے تھے کہ جیسے کوئی سائیس!۔

وہ اس گھر کا بادشاہ تھا جس کو سب خراج ادا کرتے تھے۔ اس کا کام صرف پروڈیوسروں کو کھانے اور شراب کی دعوتیں دینا، اور بلیک مارکیٹ سے پٹرول خریدنا تھا۔ اور ممتاز شانتی کو کامیاب ہونے کے گُر بتانا تھا۔ کہ دیکھو! اگر تم یوں مسکراؤ گی تو فلاں پروڈیوسر سے تمہیں کنٹریکٹ لینے کا ذمہ میں لیتا ہوں۔ اگر تم فلاں سیٹھ سے یوں ہاتھ ملاؤ گی تو اس کا مطلب ہے کہ دس ہزار روپے اسی رات ہماری جیب میں ہوں گے۔

میں وہاں بیٹھا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ میں کس دنیا میں آنکلا ہوں۔ وہاں ہر چیز مصنوعی تھی۔ ولی صاحب، نظامی صاحب کے حکم پہ اُن کا سلیپر اٹھا کے لائے اور جھک کر ان کے قدموں میں رکھ دیا۔ اس میں بناوٹ تھی۔۔۔ خدا کی قسم! یکسر بناوٹ تھی۔

اور ممتاز شانتی دوسرے کمرے میں معمولی لباس میں۔ نہایت معمولی لباس میں، کھڑکی کے پردوں کے لیے کیلیں ٹھونک رہی تھی، اور نظامی کہہ رہا تھا۔ "منٹو صاحب! یہ بچّی نہایت سادہ ہے۔ فلم لائن میں رہ کر بھی اسے آس پاس کی دنیا کا کچھ علم نہیں۔ مردوں کی طرف تو یہ نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی اور یہ سب میری تربیت کا نتیجہ ہے۔"

میرا دل کہتا تھا کہ یہ سب فراڈ ہے، یہ سب جعل ہے، لیکن مجھے نظامی صاحب کی اُن کے منہ کے سامنے تعریف کرنا پڑی۔

لیکن بات نور جہاں کی ہو رہی تھی۔

ممتاز شانتی کو سیدھے راستے پر لگانے اور اس کو صالح تربیت دینے کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں۔ تو نظامی صاحب نے نور جہاں کا ذکر کیا اور مجھے بتایا کہ ان دنوں وہ بھی ان کے زیرِ سایہ ہے۔ اور ممتاز کی طرح تربیت حاصل کر رہی ہے۔ آپ نے کہا:

"منٹو صاحب! اگر یہ لڑکی زیادہ دیر لاہور میں رہتی تو اس کا بیڑہ غرق ہو جاتا۔ میں نے اسے یہاں اپنے پاس بلا لیا ہے اور سمجھایا ہے کہ دیکھو بیٹیا! صرف فلم سٹار بننے سے کچھ نہیں ہو گا کوئی سہارا بھی ہونا چاہیئے۔ اول تو شروع میں عشق لڑانے کی کوئی ضرورت نہیں اِدھر اُدھر دونوں طرف سے خوب کماؤ۔ جب بینک میں تمہارا کافی روپیہ جمع ہو جائے تو کسی ایسے شریف آدمی سے شادی کر لو جو ساری عمر تمہارا غلام بن کے رہے۔ آپ کا کیا خیال ہے منٹو صاحب! آپ تو بڑے دانا ہیں۔"

میری ساری دانائی تو نظامی صاحب کے فلیٹ میں داخل ہوتے ہی نیچے فٹ پاتھ پر بھاگ گئی تھی۔ میں کیا جواب دیتا؟ بس کہہ دیا کہ آپ جو کر رہے ہیں وہ مصلحت کے خلاف کیونکر ہو سکتا ہے۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے آواز دے کر نور جہاں کو بلایا مگر اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور چند لمحات کے بعد نور جہاں کی

آواز کسی کمرے سے آئی "ابھی آتی ہوں، کمال صاحب کا فون آیا ہے۔"

نظامی صاحب زیرِ لب مسکرائے۔ یہ کمال صاحب، حیدر امروہی تھے — "پکار کے شہرت یافتہ" نظامی صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"میں عرض کر رہا تھا کہ سہارا ہونا چاہیئے تو نورجہاں کے لیے کمال امروہی سے بہتر سہارا اور کون ہو سکتا ہے۔ لیکن میں اس سے صاف صاف کہہ چکا ہوں کہ شادی وادی کا معاملہ غلط ہے بس اپنا اُلّو سیدھا کیئے جاؤ۔ کمال کما سکتا ہے۔ اس کی آدھی کمائی اگر نورجہاں کو مل جایا کرے تو کیا ہرج ہے۔ اصل میں منٹو صاحب، ان ایکٹرسوں کو روپیہ کمانے کے گُر آنے چاہئیں۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "آپ گُرو جو موجود ہیں۔"

نظامی خوش ہو گیا اور اس نے مجھے فوراً ایک فسٹ کلاس لیمن سکواش پلایا

بس یہاں — نظامی صاحب کے فلیٹ میں، جہاں نورجہاں کی سائنٹیفک ... لیتے رہتے ... ہی تھی۔ اس کو وہ تمام چلتر خاص ... میں سکھائے جا رہے تھے۔ میری نورجہاں سے سرسری سی ملاقات ہوئی، اور میرا ردِ عمل یہ تھا کہ یہ لڑکی اپنی جوانی کی منزلیں بڑی سرعت سے طے کر رہی ہے اور جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور ہنسی تجارتی رنگ اختیار کر رہی ہے، اور جو موٹاپے

کی طرف مائل ہے، اپنے استاد کی بہترین شاگرد ثابت ہوگی۔

لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

نظامی کی خواہش دراصل یہ تھی کہ جس طرح ممتاز شانتی اس کے قبضے میں ہے اور اس کا رعب داب تسلیم کرتی ہے۔ اسی طرح وہ ایک بوڑھی نائکہ کی طرح نورجہاں کو بھی اپنی نوچی بنالے۔

——ممتاز شانتی کی ساری آمدن نظامی کی تحویل میں رہتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ممتاز شانتی کے مقابلے میں نورجہاں کی قدر و قیمت بہت زیادہ تھی اور نظامی کا ہوشیار دماغ اچھی طرح جانتا تھا کہ نورجہاں کا مستقبل خیرہ کن ہے۔ چنانچہ وہ اس کو اپنے جال میں پھنسانے کی تیاریاں مکمل کر رہا تھا کہ......

سید شوکت حسین رضوی بمبئی پہنچ گیا۔ وہ شوکت، وہ رضوی جس سے نورجہاں کا عشق پنچولی اسٹوڈیوز میں لڑ چکا تھا۔ مقدمہ بازی بھی ہو چکی تھی اور بچنے کی خاطر نورجہاں نے عدالت میں یہ بیان دیا تھا کہ شوکت صاحب سے اس کا کوئی ناجائز تعلق نہیں، وہ تو انھیں اپنا بھائی سمجھتی ہے۔

نورجہاں کا یہ عدالتی بھائی اب بمبئی میں موجود تھا۔ وسیع و عریض بمبئی میں، جو فلمی دنیا کی ہالی ووڈ تھی۔

میں نے شوکت سے بات کی کہ میں نورجہاں سے ملا تھا۔ اس وقت مجھے ان کے رومان کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا۔ میں یہ تو

جانتا تھا کہ دونوں کے تعلقات کشیدہ ہیں۔ میں نے صرف برسبیلِ تذکرہ اس کو بتایا تھا کہ نور جہاں سے میری ملاقات نظامی صاحب کے گھر میں ہوئی ہے۔ ہرن مارکہ شراب کا گلاس زور سے تپائی پر رکھ کر اس نے بڑی تندہی سے کہا۔ "لعنت بھیجو اُس پر"

میں نے ازراہِ مذاق کہا۔" میں ہزار بار اس کے لیے تیار ہوں، مگر بھئی! وہ تمہارے' خاندان' کی ہیروئن رہ چکی ہے۔"

شوکت ذہین ہے۔ فوراً سمجھ گیا کہ میں لفظ" خاندان" پر کھیلا ہوں اور اسے ذومعنی استعمال کیا ہے۔ مسکرا دیا۔" منٹو تم بہت شریر ہو۔ لیکن بات یہ ہے کہ میں اس کے متعلق کوئی بات نہیں سننا چاہتا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ بمبئی میں ہے۔ سالی! میرے پیچھے پیچھے آئی ہے۔ لیکن مجھے اب اس سے کوئی سروکار نہیں۔"

میں نے جب اس کو بتایا کہ وہ کمال امروہی کو ٹیلیفون کر رہی تھی، اور یہ کہ نظامی ان دونوں کو قریب لانا چاہتا ہے تو میں نے محسوس کیا کہ وہ بظاہر بے اعتنائی اور بے پرواہی ظاہر کر رہا ہے۔ مگر اندرونی طور پر سخت بے چین ہو گیا ہے۔ اس لیے فوراً ہی ہرن مارکہ وسکی کا ایک اور ادھا مرزا مشرف سے منگوایا اور ہم رات دیر تک پیتے رہے۔

اس دوران میں لمبے وقفوں کے بعد نور جہاں کا ذکر چھڑ جاتا تھا۔ میں نے شوکت کی گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ ابھی تک اس کی محبت میں گرفتار ہے۔ بھائی والا معاملہ تو محض حکمتِ عملی تھا۔ اس

کو وہ راتیں یاد آرہی تھیں جب نغموں کی ننھی منّی شہزادی اس
کی آغوش میں ہوتی تھی۔ اور جب غالباً دونوں ایک دوسرے
سے جُدا نہ ہونے کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔

میں نے ایک دن شوکت سے پوچھ ہی لیا۔ "دیکھو یار بتاؤ!
سچ سچ بتاؤ ــــ! کیا تمہیں نورجہاں سے محبت نہیں ہے؟"

شوکت نے زور سے اپنے سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور کسی
قدر کھسیانے پن سے کہا۔ "ہے یار ــ ــ ہے ــ ــ مگر لعنت بھیجو
اس پر۔ میں اس کو آہستہ آہستہ بھول جاؤں گا۔"

لیکن قدرت زیرِ لب مسکرا رہی تھی، وہ جو فیصلہ کر چکی تھی،
اٹل تھا۔ شوکت کا کنٹریکٹ سیٹھ وی۔ ایم۔ ویاس سے ہوا۔ جو اس
سے پہلے ایک فلم کے لیے نورجہاں سے معاہدہ کر چکا تھا۔

اب لگے ہاتھوں سیٹھ وی۔ ایم۔ ویاس کے متعلق بھی سُن لیجیے۔
یہ ایک کائیاں آدمی ہے۔ شروع شروع میں طبلچی تھا۔ پھر کیمرہ قلی ہوا۔
آہستہ آہستہ کیمرہ مین بن گیا۔ ترقی کے اور زینے طے کیے تو ڈائرکشن
کا موقع مل گیا۔ یہاں سے چھلانگ لگائی تو پروڈیوسر۔ اب وہ ڈائرکٹر
اور پروڈیوسر ہے اور لاکھوں میں کھیل رہا ہے۔

بہت ہی منحنی قسم کا انسان ہے۔ مجھ سے بھی کہیں پتلا۔ اتنا
پتلا کہ اُسے قمیص کے نیچے ایک موٹا اُونی بنیان پہننا پڑتا ہے
کہ اس کی پسلیاں لوگوں کو نظر نہ آئیں۔ مگر بلا کا پھرتیلا ہے اور بڑا

محنتی۔ اس کے مقابلے میں پہلوان تھک جائیں گے مگر وہ ڈٹا رہے گا۔ جیسے مشقت اس پر اثر انداز ہو ہی نہیں سکتی۔

اس کی ایک خوبی اور ہے کہ وہ اپنے ذاتی سرمائے سے فلم نہیں بناتا۔ ایک فلم تیار کر کے اور اس کو ٹھکانے لگا کر وہ اپنے دوسرے فلم کا اعلان کر دیتا ہے۔ اس وقت کے جتنے اونچے ستارے ہوتے ہیں وہ اپنی کاسٹ میں جمع کر لیتا ہے۔ کہانی کا اس وقت نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ کوئی نہ کوئی "فائی نینسر" اس کے دام میں آجاتا ہے۔ چنانچہ اس سے روپیہ لے کر وہ 'کالی' کا نام لے کر کام شروع کر دیتا ہے۔

نورجہاں بمبئی آئی تو اُس کو پتہ چل گیا۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی نورجہاں سے کنٹریکٹ کر لیا۔ اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ "خاندان" اور دوسرے فلموں کی قابلِ رشک کامیابی کے بعد اس کا نام ہی کسی "فائی نینسر" کو پھانسنے کے لیے کافی ہے۔ اور جب اس کو معلوم ہوا کہ "خاندان" کا ڈائرکٹر بھی بمبئی میں موجود ہے تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اُس نے فوراً اپنے کارندے دوڑائے۔ شوکت حسین رضوی سے کئی ملاقاتیں کیں اور اس کے ساتھ بھی ایک پکچر کا معاہدہ کر لیا۔

فلم کیا ہوگا؟ کیسا ہوگا؟ کہانی کیا ہے؟ یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ مگر سیٹھ وی۔ ایم ڈیاس نے جب اپنے 'فائی نینسر' کو نورجہاں اور شوکت سے اپنی "سن رائز پکچرز" کے کنٹریکٹ دکھائے تو

مطلوبہ سرمایہ کسی دقت کے بغیر فوراً مل گیا۔

قدرت بھی عجیب کھیل کھیلتی ہے۔ نہ شوکت کو معلوم تھا کہ نور جہاں "سن رائیز" میں آچکی ہے اور نہ نور جہاں کو پتہ تھا کہ اس کا عدالتی بھائی شوکت بھی اس کا ہمراہی ہے۔ بڑی لمبی داستان ہے۔ میں اسے مختصر کرنا چاہتا ہوں۔

ایک دن یہ راز فاش ہو گیا۔ نظامی بہت گھبرایا کہ ایسا نہ ہو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ جو فلم شوکت کو ڈائرکٹ کرنا تھی، اس کی ہیروئن نور جہاں مقرر کی گئی تھی۔ دونوں کا "سنجوگ ملن" نظامی کے لیے بڑا اندوہناک ثابت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ نور جہاں کے والی کی حیثیت سے اس نے سیٹھ ویاس سے کہا کہ وہ ہرگز ہرگز اس قسم کا سلسلہ برداشت نہیں کرے گا۔ مگر سیٹھ ویاس نظامی سے کچھ زیادہ ہی کائیاں نکلا کہ اس نے اپنی گجراتی حکمتِ عملی سے جو کہ پنجابی حکمتِ عملی کے معاملے میں بڑی گہری اور دھانسو قسم کی ہوتی ہے نظامی کو ہموار کر دیا اور وہ راضی ہو گیا کہ نور جہاں شوکت کی پکچر میں کام کرے گی۔ اور ضرور کرے گی، چاہے اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے۔ چنانچہ وہیں دفتر میں دونوں نے ایک دوسرے سے معانقہ کیا۔ ہاتھ ملائے اور ایک دوسرے کے بھائی بن گئے۔

اب دونوں اپنی اپنی جگہ پہ خوش تھے۔ سیٹھ ویاس اس لیے کہ اس نے اپنا اُلّو سیدھا کر لیا تھا، اور نظامی اس

لیے کہ اس نے ایک فلمی سیٹھ کی خوشنودی حاصل کر لی تھی۔ اور اس کو زیرِ احسان کر لیا تھا۔ سیٹھ ویاس کٹر قسم کا وشنو تھا۔ ورنہ نظامی اسے اسی رات گھر بلا کر ممتاز شانتی کے ہاتھ کے پکے ہوئے مرغ اور پلاؤ سے اپنی اور اس کی دوستی ضرور مستحکم کرتا۔ اور اگر سیٹھ بوتل کا رسیا ہوتا تو وہ اپنے مریل مینجر کے ذریعے سے دو عدد سکاچ بلیک مارکیٹ سے ضرور منگواتا۔

بہرحال بات پکی ہو گئی۔ کیونکہ نظامی سینے پر ہاتھ رکھ کر سیٹھ ویاس سے کہہ چکا تھا کہ "سیٹھ! اب جبکہ تم نے مجھے بھائی کہہ دیا ہے۔ میں تم کو بچن دیتا ہوں کہ مینہ یا آندھی یا...... طوفان بھی ہو۔ تمہاری شوٹنگ ہو گی تو بے بی نورجہاں وقت پر پہنچے گی۔"

اب ایک لطیفہ سنیئے۔ بات تو خیر پکی ہو گئی تھی۔ میرا بھی سیٹھ ویاس سے ایک کہانی کے لیے کنٹریکٹ ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں اور شوکت اس کا موضوع تلاش کرنے میں مصروف تھے۔ "پیشگیاں" مل چکی تھیں۔ اس لیے ناسک کی ہرن مارکہ وسکی کی فراوانی تھی۔ دور پر دور چلتے تھے۔ مرزا مشرّف، چاولہ اور سہگل (یہ دونوں حضرات اب بڑے ڈائرکٹر بن چکے ہیں) ہماری اردلی میں ہوتے تھے، ذرا وسکی ختم ہوئی اور چاولہ بھاگے ناگپاڑے۔ کسی اور چیز کی ضرورت ہوتی تو مرزا مشرّف حاضر تھے۔

لطیفے میں سے لطیفہ نکلتا ہے۔ مرزا مشرف ہمارے ساتھ پیتے تھے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ تیسرے پگ کے بعد رونا شروع کر دیتے۔ زار و قطار روتے تھے۔ شوکت کے ہاتھ پاؤں چومتے اور وہ شکوک جو شوکت کے دل میں ان کے بارے میں کبھی گزرے بھی نہیں تھے، ان کا ذکر کرتے اور کہتے تھے کہ وہ سب غلط ہیں۔ اس کے بعد وہ رو رو کر اپنی نئی بیاہتا بیوی کو یاد کرنے لگتے تھے۔ اور پھر گانا سنانا شروع کر دیتے تھے۔۔ یہ سب فراڈ یعنی جعل تھا۔ مگر فلمی دنیا میں اس کے سوا اور ہونا بھی کیا ہے؟۔

اب میں اصل لطیفے کی طرف آتا ہوں۔ کہ وہ اس مضمون کا سب سے دلچسپ حصہ ہے۔

سیٹھ دیاس اپنی فلم کی شوٹنگ کر چکا تھا۔ جو سین فلمائے گئے تھے۔ ان میں نور جہاں نہیں تھی۔ یعنی دوسرے الفاظ میں شوکت اور نور جہاں کی ابھی تک صحیح معنوں میں ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایک رات نوٹس بورڈ پر یہ اعلان چپاں ہو گیا کہ نور جہاں سیٹ پر آ رہی ہے۔ اس کو باضابطہ طور پر کمپنی کی طرف سے مطلع کر دیا گیا تھا۔

اسی رات کو میں گھومتا گھامتا شیواجی پارک میں رفیق غزنوی کے پاس چلا گیا۔ اس مشہور نغمہ ساز اور موسیقار کے پاس جس کی مختلف ٹاپیوں کی گرہوں میں مختلف قسم کے رومان بندھے ہیں۔

رفیق غزنوی میرا دوست ہے۔ میرے اس کے بڑے

ہی بے تکلف مراسم ہیں۔ میں اس کے فلیٹ پر پہنچا تو محفل جمی ہوئی تھی۔ میں بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صوفے پہ تازہ ترین بیوی خورشید عرف "انورادھا" بیٹھی ہے۔ اس کے ساتھ نورجہاں ہے۔ ایک کرسی پہ شری نظامی جی براجمان ہیں۔ اور فرش پہ ہمارے رفیق غزنوی صاحب یوں بیٹھے ہیں جیسے کسی سومنات پہ حملے کی تیاری کر رہے ہوں۔

رفیق غزنوی کے متعلق مَیں چند سطروں یا چند صفحات میں کچھ لکھ نہیں سکتا۔ اس کا تشخص و کردار اتنا وسیع ہے کہ اس پہ اگر کوئی ضخیم کتاب نہیں تو ایک طویل مضمون ضرور ہونا چاہیئے۔ میں اپنے قارئین سے وعدہ کرتا ہوں کہ یہ قرض بھی میں ایک نہ ایک دن ضرور چکا دوں گا۔

رفیق میرا دوست ہے۔ میں اگر کل کلاں موت کی آغوش میں چلا گیا اور وہ بھی کچھ دیر بعد میری طرح سو گیا تو حقِ رفاقت کون ادا کرے گا۔ کون اتنے بڑے موسیقار، اتنے بڑے دلچسپ کردار کی داستانِ حیات بیان کرے گا۔ انشاءاللہ یہ میں کروں گا مگر وقت آنے پر۔

خیر، یہ جملہ معترضہ تھا۔۔۔ رفیق۔۔۔ سومنات پر اپنے تازہ ترین حملے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ نظامی اس سے غافل تھا۔ یا نہیں۔ یا نورجہاں کو اس کے ارادوں کا علم تھا۔ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

مجھے نظامی سے اتنا معلوم ہوا کہ ممتاز (شانتی) ابھی آنے ہی والی ہے۔ میں حیران تھا کہ ادھر شوٹنگ ہونے والی ہے۔ ادھر اسکاچ کے دَور چل رہے ہیں۔ نظامی کے ہاتھ میں گلاس تھا۔ نورجہاں بھی ہولے ہولے خوشرنگ مشروب اپنے ہونٹوں سے چوس رہی تھی۔ خورشید عرف انورادھا تو خیر پختہ کارشرابیوں کی طرح گھونٹ بھرتی تھی۔ اور رفیق — غزنہ کا رفیق۔ اس غزنہ کا جس نے محمود پیدا کیا تھا اور جو ایک ایاز کی محبت میں گرفتار تھا۔ گلاس زمین پر رکھے میراثیوں کے لطیفے سُنا رہا تھا۔

میں جب اندر داخل ہوا تو اس نے حسب عادت استقبال کے طور پر ایک بھاری بھرکم گالی اپنے منہ سے اُگلی۔ لیکن پھر فوراً ہی شریفانہ لب و لہجہ اختیار کر کے مجھ سے کہا۔ "جانتے ہو اِن کو؟"

میں نے جواب دیا۔ "جانتا ہوں"

رفیق چار پگ پینے کے بعد عام طور پر شرابی ہو جاتا ہے۔ لکنت بھرے لہجے میں اس نے مجھ سے کہا۔ "نہیں! تم کچھ نہیں جانتے منٹو — یہ نورؔ ہے — نورجہاں ہے۔ سرورِجاں ہے۔ خدا کی قسم! ایسی آواز پائی ہے کہ بہشت میں خوش الحان سے خوش الحان حُور بھی سنے تو اسے سبندور کھلانے کے لیے زمین پر اتر آئے۔"

میں جانتا تھا کہ وہ تعریف کے یہ پُل کیوں باندھ رہا تھا۔

دراصل ان پلوں کے ذریعے ہی وہ نورجہاں کے جسم تک پہنچنا چاہتا تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ نورجہاں کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ رفیق کی یہ باتیں سنتی تھی اور اسے خوش کرنے کے لیے ایک مصنوعی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پہ پیدا کر لیتی تھی
رفیق اول درجے کا کنجوس ہے۔ مگر اس دن اس نے غیر معمولی فیاضی کا مظاہرہ کیا۔ بوتل میں سے میرے لیے ایک بہت بڑا پگ عنایت کیا اور اصرار کیا کہ میں اسے ایک ہی جرعے میں ختم کر دوں۔ تاکہ ایک دوسرا بھی رہے۔

سب پی رہے تھے۔ نورجہاں کا پگ بہت ہلکا تھا جسے وہ آہستہ آہستہ ہونٹوں کے ذریعے چوس رہی تھی۔ جیسے مکھیاں پھولوں سے آہستہ اور ہولے ہولے رس چوستی ہیں۔

رفیق، نورجہاں کی تعریف و توصیف کے مزید پل باندھ رہا تھا کیونکہ پہلے پل سب ٹوٹ گئے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

خورشید عرف انورادھا نے اپنے دبلے پتلے مگر خوبصورت ہاتھ سے ٹیلی فون کا چونگا اٹھایا اور کان کے ذریعے سے دوسری طرف کی آواز سنی اور سٹپٹا سی گئی۔ فوراً چونگے کا منہ بند کر کے نورجہاں سے مخاطب ہوئی ۔ "سیٹھ دیا اس ہیں۔"
نظامی نے کسی قسم کی پریشانی کا اظہار نہ کیا اور کہا۔ "بٹیا! کہہ دو

کہ نور جہاں ان کے یہاں نہیں ہے۔"

خورشید عرف انورادھا نے سیٹھ دیاس سے مناسب و موزوں الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ یہاں نہیں ہے۔

جب ٹیلی فون کا سلسلہ ختم ہوا تو رفیق نے خورشید سے کہا۔ "شیداں ـــــ! جاؤ، اندر سے ہارمونیم لاؤ ـــــ سیٹھ دیاس جائے جہنم میں۔"

شیداں اندر گئی اور ہارمونیم کی پیٹی لے آئی۔ رفیق نے اس کو کھولا۔ اس کا ڈھکنا اٹھایا اور ہوا بھر کے اپنے مخصوص انداز میں ایک سُر چھیڑا اور خود ہی جھومنے لگا۔ "ہائے۔ سبحان اللہ! ـــــ واہ!"

دیر تک وہ باجے کے مختلف سُروں کو چھیڑ کر "ہائے، سبحان اللہ، اور واہ واہ" کرتا رہا ـــــ میرا خیال ہے، رفیق پر علّامہ اقبالؔ کا یہ مصرعہ صادق آتا ہے ؎

دیتے ہیں سرور اوّل، لاتے ہیں شراب آخر

گانے سے پہلے ہی رفیق سامعین پر وجد طاری کر دینے کا عادی ہے۔ مگر اس دن وہ نہ گایا۔ اس لیے کہ اس کی ساری توجہ نور جہاں پر تھی۔ ایک سُر چھیڑ کر اس نے مخمور آنکھوں سے نور جہاں کی طرف دیکھا اور درخواست کی۔ "نور ـــــ بس ہو جائے کوئی چیز ـــــ ہائے کتنا پیارا اور مدھر سُر ہے ـــــ چلو گاؤ ـــــ"

آپ پردے پر ایکٹر، ایکٹرسوں کے ڈرامے دیکھتے ہیں اور ان کی کردار نگاری سے متاثر ہوتے ہیں۔ میں آپ کو اس ڈرامے کی ایک جھلک دکھاتا ہوں۔ جو اس روز وہاں کھیلا گیا۔ — جیتے جاگتے سو فیصدی حقیقی ڈرامے کی جھلک۔

نورجہاں نے ہارمونیم صوفے پر رکھ لیا۔ اس کے پاس خورشید عرف انورادھا وسکی کا گلاس ہاتھ میں لیے بیٹھی ہے۔ رفیق غزنوی قالین پر آلتی پالتی مارے نورجہاں کی طرف اپنی عشق پیشہ آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اور گانا سننے سے پہلے ہی جھوم رہا ہے۔ دائیں ہاتھ کرسی پر شری نظامی جی براجمان ہیں۔ اور ان کے ساتھ ہی خاکسار ہے جو اپنا دوسرا پگ پی رہا ہے۔

نورجہاں گانا شروع کرتی ہے۔ غالباً پیلو کی ٹھمری ہے۔ ؎

تورے نین کا جوبن کارے

کہ ایک موٹر ہولے سے پورچ میں رکتی ہے۔ ایک صاحب اس کے اندر سے نکلتے ہیں اور سیدھے اندر چلے آتے ہیں — یہ سیٹھ ویاس ہیں۔

ایک لحظہ کے لیے سب بوکھلا جاتے ہیں۔ مگر نظامی فوراً ہی حالات پر قابو پا لیتا ہے۔ سیٹھ ویاس کی آمد سے گویا بے خبر وہ چلا کر خورشید سے کہتا ہے۔ "بیٹیا! یہ کیا ظلم کر رہی ہو تم — اسے اتنی تکلیف ہے اور تم اسے گانے پہ مجبور کر رہی ہو۔

دیکھو! ایک بول گانے کے بعد اس کا کیا حال ہو گیا ہے؟"
پھر وہ نورجہاں سے تشویش بھری آواز میں کہتا ہے۔ "لیٹ جاؤ
نورجہاں ـــــ لیٹ جاؤ۔" اور وہ آگے بڑھ کر اسے لٹا دیتا ہے۔
نورجہاں زور زور سے کراہنا شروع کر دیتی ہے۔ رفیق بھی اٹھ
کر انتہائی تشویش کا اظہار کرتا ہے۔ نظامی خورشید سے مخاطب
ہوتا ہے، کسی قدر تیز لہجے میں۔ "شبداں! اٹھ، بیٹھی کیا سوچ
رہی ہے، جا جلدی سے گرم پانی کی بوتل لا۔ بڑے زور کا دورہ
پڑا ہے۔"

شبداں اٹھ کر تیز قدمی سے اندر چلی جاتی ہے۔ نظامی کراہتی
ہوئی نورجہاں کو پچکارتا ہے۔ پھر سیٹھ ویاس سے مخاطب
ہوتا ہے۔ "بھائی جان! ـــــ وہ۔ وہ تکلیف ہے۔ وہی
جو عورتوں کو ہوا کرتی ہے۔"

سیٹھ ویاس خاموش رہتا ہے۔ میں بھی دم بخود ہوں۔
نظامی ایک بار پھر کراہتی ہوئی، دوہری ہوتی ہوئی نورجہاں
کو پچکارتا ہے اور سیٹھ ویاس کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور کہتا
ہے۔ "کل سے غریب درد کے مارے پیچ و تاب کھا رہی
ہے۔۔ مجھ سے کہتی تھی۔ چچا جان! مجھ سے شوٹنگ نہ ہو سکے
گی۔ پر میں نے کہا۔ نہیں بیٹا! یہ بڑا شگون ہے۔ یہاں بمبئی
میں یہ تمہاری پہلی پکچر ہے اور پھر شوٹنگ کا پہلا دن ـــــ

یہ بھی چھوڑو۔ سیٹھ ویاس مجھے اپنا بھائی کہہ چکا ہے۔ تم مرجاؤ مگر ضرور جاؤ۔۔۔ چنانچہ ہم اسی لیے یہاں آئے تھے کہ رفیق سے تھوڑی سی برانڈی لیں اور اس کی کار لے کر اسٹوڈیو پہنچ جائیں۔ آپ کچھ فکر نہ کریں۔ آپ کا نقصان میرا نقصان ہے۔ نورجہاں ابھی پہنچتی ہے۔۔۔ آپ میرے بھائی ہیں۔"

سیٹھ ویاس خاموش رہا۔۔۔ نظامی کے سوا اور سب خاموش تھے۔ رفیق غزنوی دانتوں سے اپنے ناخن کاٹ رہا تھا۔ میں گلاس ہاتھ میں لیے سوچ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟

کہانی میری تھی۔ میوزک رفیق غزنوی دے رہا تھا۔ اور سیٹھ ویاس، ہمارا آقا، عین موقعہ پر پہنچ گیا تھا۔ جبکہ ہم رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ رنگ رلیاں ہی تو تھیں۔ اور کیا تھا۔ وسکی کا دور چل رہا تھا اور نورجہاں گا رہی تھی کہ

تورے نین کا جوبن کارے

اچھا خاصا مجرا ہو رہا تھا۔

نظامی نے اپنے مخصوص انداز میں سیٹھ ویاس سے کچھ اور باتیں کیں اور اسے یقین دلایا کہ جب دونوں ہی ایک دوسرے کو بھائی کہہ چکے ہیں تو دلوں میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہونی چاہیئے۔

اتنے میں خورشید گرم پانی کی بوتل لے کر آگئی۔ جو

نور جہاں کے پیٹ پر رکھ دی گئی۔ اس سے اس کو کچھ سکون ہوا۔
اس پر نظامی نے سیٹھ ویاس سے جو ابوالہول بنا بیٹھا تھا، کہا۔
" آپ تشریف لے چلئے، میں اور رفیق نور جہاں کو ساتھ لے کر
ابھی آتے ہیں۔"

پھر اس نے اپنے آپ سے کہا۔ " میرا خیال ہے، خورشید بھی
ساتھ چلے۔ عورتیں عورتوں کے سب معاملات جانتی ہیں۔"

سیٹھ ویاس اٹھا اور اپنی ٹوپی ٹھیک کرتا ہوا چلا گیا ——
سب کی جان میں جان آئی۔ نور جہاں نے اپنے پیٹ سے گرم
پانی کی بوتل الگ کی، جو ٹھنڈے پانی سے بھری ہوئی تھی اور
نظامی سے کہا۔ " نظامی چچا! آپ نے تو کہا تھا۔ مت جانا۔"

نظامی سنجیدہ ہو گیا۔ " بیٹا! وہ میں نے تمہارے بھلے
کے لیے ہی کہا تھا۔ پہلے ہی دن آدمی شوٹنگ پہ چلا جائے۔
اور پروڈیوسر کو پھیرے نہ کرائے تو وہ سر پر سوار ہو جاتا ہے۔
اپنی ممتاز سے پوچھو، جب تک سٹوڈیو سے گاڑی نہ آئے،
مجال ہے جو وہ شوٹنگ میں جائے۔ اور پھر جب گاڑی بھی آتی
ہے تو میں اسے کم از کم ایک گھنٹہ نیچے کھڑی رکھتا ہوں۔
رائے بہادر چونی لال میرے اتنے دوست ہیں مگر میں ان کی
بھی پروا نہیں کرتا —— بعض دفعہ تو ایسا بھی ہوا کہ وہ خود اپنی
گاڑی میں ممتاز کو لینے آئے۔ بہرحال اب سب ٹھیک ہے۔

خود آیا ہے یہاں چل کر، اور پھر تم بیمار ہو اور بیماری کی حالت میں جا رہی ہو۔ سیٹھ ویاس کو اس کا خیال رہے گا۔"

نظامی نے کچھ دیر اور پروڈیوسر اور آرٹسٹ کے باہمی رشتے کی باریکیاں بیان کیں اور وہ تمام گر بتائے جو آرٹسٹ کو استعمال کرنے چاہییں۔ اس کے بعد گفتگو آہستہ آہستہ شوکت حسین رضوی میں تحلیل ہو گئی۔ نظامی اپنی باتوں سے زبردستی نور جہاں کے دل و دماغ میں یہ خیال ٹھونسنا چاہتا تھا کہ اب اس کو اس شخص سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کے دل میں اب اس کے لیے کوئی جگہ نہیں اور یہ کہ اسے وہی راستہ اختیار کرنا چاہیے جس پر ممتاز شانتی اس کی ہدایات کے مطابق اتنے عرصے سے چل رہی ہے اور اتنا نام اور روپیہ پیدا کر چکی ہے۔

اس گفتگو میں مجھے بھی حصہ لینا پڑا کہ شوکت سے میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی اور وہ اس بات کا اقرار بھی کر چکا تھا کہ اسے نور جہاں سے محبت ہے۔ اور مرزا مشرف سے جو اس کا سلسلہ جاری تھا، اس سے تو قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ دوسری عورتوں کی آغوش میں نور جہاں کی یاد کو دفن کرنا چاہتا ہے۔ اور ہرن مارکہ جیسی تھرڈ کلاس وسکی سے اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اصلاً شوکت گھڑی ساز تھا اور اپنے فن میں مہارتِ تامہ رکھتا تھا۔ اس لیے وہ ہر شے کی نوک پلک درست کرتا رہتا تھا۔ اس کی طبیعت کسی اکھڑے ہوئے پُرزے، کسی ٹیڑھی کیل، کسی غلط وقت دینے والی گھڑی، کپڑے میں کسی شکن اور سلوٹ کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اس کی جبلّت میں ایک نظم ہے۔ وہی نظم جو ایک اچھی گھڑی میں ہوتا ہے۔ مگر یہاں نور جہاں کے معاملے میں وہ خود کو بے بس سمجھتا ہے۔ وہ اس گھڑی کے کل پرزے کیسے درست کر سکتا تھا۔ جس کو دل کہتے تھے۔ اگر یہ کوئی ایسی چیز ہوتی جسے وہ اپنے سامنے رکھ کر محدّب شیشے میں دیکھ سکتا۔ اس کی بال کمانی اور اس کی گراریوں کا مطالعہ کر سکتا۔ تو یقیناً وہ پیچ کش لے کر اسے سب کا سب کھول دیتا۔ جو گڑبڑ پیدا ہونے کا موجب ہو رہی تھیں۔ مگر یہ دل کا معاملہ تھا۔

اُدھر نور جہاں بھی جو اپنے گلے سے باریک سُر کی نکال سکتی تھی، حیران تھی کہ اپنے دل سے شوکت کی یاد کیسے نکالے۔ وہ خیال بڑے بڑے استادوں کی طرح گا سکتی تھی۔ مگر ایک خیال اس کے دل و دماغ پہ ہر وقت چھایا رہتا تھا۔ اور یہ خیال اس کے محبوب کا تھا۔ بانکے چھبیلے شوکت کا۔ جس نے اس کی زندگی کو بہترین لذّت بخشی تھی۔ جس نے

اس کے بدن میں وہ حرارت پیدا کی تھی جو موسیقی جیسی لطیف چیز بھی پیدا نہیں کر سکتی ــ وہ اُسے کیسے بھول سکتی تھی۔ وہ جو اس کے جسم میں ایک عرصہ تک ڈبکیاں لگاتا رہا تھا۔

شوکت کے متعلق گفتگو شروع ہوئی اور نور جہاں نے اوپرے دل سے اس کے متعلق اپنی نفرت کا اظہار کیا تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے اس سے کہا:۔

"نور جہاں! یہ سب بکواس ہے۔ جو کچھ تم نے کہا ہے۔ خدا کی قسم وہ تمہارے دل سے نہیں نکلا اور جو کچھ میں اس خرزاد شوکت سے سنتا ہوں۔ خدا کی قسم! وہ بھی قطعاً جھوٹ ہوتا ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے پر مرتے ہو۔ مگر دونوں ہی خود فریب ہو ــــ ابھی کل مصوّر کے دفتر میں تمہاری باتیں ہو رہی تھیں۔ اور ــــ کل شام کیا ــــ ہر شام جب میں اور شوکت پینا شروع کرتے ہیں تو وہ کسی نہ کسی حیلے تمہاری بات چھیڑ دیتا ہے۔ پھر خود ہی کہتا ہے کہ اس کی بات نہ کرو۔ یہی حال تمہارا ہے۔ میں نے تمہاری یاد میں اس کی آنکھوں میں آنسو بھی دیکھے ہیں اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ وہ اگر تم سے دور رہا، تو وہ اپنی جوانی اور اپنی صحت تباہ کر لے گا۔ وہ تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

معلوم نہیں، تم نے اس پر کیا جادو پھونک رکھا ہے۔"
نورجہاں پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔
میں نے پھر کہنا شروع کیا — "نورجہاں! خود فریبی سے کام نہ لو۔ میں مانتا ہوں کہ نظامی صاحب بڑے جہاندیدہ آدمی ہیں۔ لیکن عشق و محبّت میں وہ گر کبھی نہیں چلتے، جو زندگی کے دوسرے بازاروں میں چلتے ہیں۔ یہ کھوٹے سکّے ہیں ۔" میں ایک دم نظامی سے مخاطب ہوا: "کیوں نظامی صاحب! کیا یہ جھوٹ ہے۔"
نظامی صاحب کچھ ایسے میری تقریر میں گم تھے کہ انھوں نے جب نفی میں اپنا سر ہلایا تو انھیں مطلق اس کا احساس نہیں تھا۔ پھر جب ایک دھچکے کے ساتھ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو میں بہت آگے نکل چکا تھا۔ میں نورجہاں سے جس کی آنکھوں میں اب آنسو تیر رہے تھے، کہہ رہا تھا، "تم دونوں بے وقوف ہو۔ ایک دوسرے سے محبّت کرتے ہو مگر اسے چھپائے پھرتے ہو۔ کس سے ؟ — کن سے ! — یہ دنیا تو، معاف کرنا نورجہاں، کسی کو بھی محبت کرتے نہیں دیکھ سکتی — لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ لوگ محبّت کرنا ہی چھوڑ دیں — ممتاز شانتی کی زندگی واقعی قابلِ رشک ہے۔ نظامی صاحب جیسے شفیق

اور ہوشیار چچا کی سرپرستی میں وہ یقیناً خدا کے فضل و کرم سے اور بھی ترقی کرے گی. لیکن —— (یہاں میں پھر نظامی سے مخاطب ہوا)۔" لیکن نظامی صاحب! آپ سے یہ مخفی نہیں ہوگا کہ ہر آدمی کے لیے ایک ہی چچا کام نہیں دے سکتا۔ آپ نے جو ہدایات ممتاز کے لیے سوچی تھیں، ظاہر ہے کہ وہ نور جہاں کے لیے کارآمد نہیں ہوسکتیں. دونوں کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق ہے —— کیا میں جھوٹ کہتا ہوں؟"

میں اب نظامی کو اس مقام پر لے آیا تھا جہاں وہ میری کوئی بات جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ میں نے موقعہ غنیمت جانا اور بولتا چلا گیا۔ میں نے نور جہاں کے دل و دماغ پہ جو کہ اس کے لیے غالباً پہلے ہی سے تیار تھا، یہ حقیقت اچھی طرح مرتسم کر دی کہ وہ اور شوکت ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں اور یہ جو خود فریبی سے کام لے رہے ہیں، بڑی مہلک چیز ہے۔

نظامی جب اٹھا تو وہ کوئی خوش آدمی نہیں تھا (اس جملے میں انگریزی پن ہے مگر یہ مجھے پسند ہے) مگر اپنی فطرت سے مجبور وہ مجھ سے روکھے پن کا اظہار نہ کرسکتا تھا۔ چنانچہ اس نے نور جہاں سے یہ کہہ کر کہ وہ ٹھنڈی بوتل کی بجائے

گرم بوتل لے کر خورشید کے ساتھ سٹوڈیو چلی جائے اور وہاں وقتاً فوقتاً درد کا بہانہ کرتی رہے۔ تو اس نے بڑی خندہ پیشانی سے مجھ سے گفتگو کی اور مجھے یقین دلایا کہ میرے فلیٹ اور فرنیچر وغیرہ کا مکمل بندوبست کر رکھا ہے۔ اس کو حیرت تھی کہ میں اتنے دنوں کہاں غائب رہا۔ فلیٹ کی چابی اس کے مینیجر کے پاس تھی اور وہ میرا منتظر تھا۔ بلیک مارکیٹ سے پٹرول حاصل کرنے کے لیے بھی انھوں نے ویسا ہی مکمل انتظام کر چھوڑا تھا۔ اس کے علاوہ اُن کی دلی خواہش تھی کہ میں ان کی دعوت قبول کروں جس میں وہ میری تواضع علاوہ مرغوں کے "جونی واکر کی بلیک لیبل" سے کریں گے۔

میں نے مناسب و موزوں الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کیا، لیکن وہ مُصر تھا کہ میں ضرور اس کی دعوت قبول کروں۔ چنانچہ میں نے قبول کر لی۔ مگر مجھے یقین تھا کہ اگر میں اس کے ہاں چلا بھی گیا تو مرغ اور جونی واکر بلیک لیبل کا ذکر تک بھی نہیں ہوگا۔

خیر —— ! نظامی صاحب کو چھوڑیئے کہ وہ نظامی صاحب ہیں —— معلوم نہیں کس رعایت سے۔ ممکن ہے۔ حسن نظامی دہلوی کے مرید ہوں یا خودساختہ نظامی ہوں۔ مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ میری اس شام کی تقریر نما گفتگو نے

نظامی کے تمام پلان درہم برہم کر دیئے۔

مجھے معلوم ہوا کہ نورجہاں اب کمال امروہی سے کوئی دلچسپی نہیں لیتی۔ اس کے ٹیلی فون آتے ہیں۔ مگر وہ کوئی جواب نہیں دیتی۔ وہ اپنی سیکنڈ ہینڈ کار لے کر آتا ہے۔ مگر وہ کسی کمرے میں چھپ جاتی ہے اور نظامی کی ہدایات کے مطابق عمل نہیں کرتی۔

ان تمام باتوں کی رپورٹ میرے ذریعے سے شوکت تک پہنچ جاتی تھی۔ ہمیں اس بات کا کامل احساس تھا کہ وہ مردِ تسمہ پا نظامی کے شکنجے میں ہے اور اس کا وہاں سے نکلنا مشکل ہے۔ چنانچہ ہم نے ایک کانفرنس کی۔ جس میں نذیر لدھیانوی ایڈیٹر "مصور" ویکلی بمبئی اور شوکت شامل تھے۔ طے ہوا کہ وہیں یعنی کیڈل روڈ پر کوئی مکان حاصل کیا جائے۔

نذیر لدھیانوی کی کوششوں سے کیڈل روڈ پر ساحلِ سمندر کے بالکل قریب گراؤنڈ فلور پر ایک نہایت عمدہ فلیٹ مل گیا، جس میں تین غسل خانے تھے۔ کئی کمرے تھے اور ایک وسیع و عریض ڈرائنگ روم تھا۔

نذیر نے جو کہ ۱۷۔ اڈلفی چیمبرز جیسے واہیات فلیٹ میں رہتے رہتے اکتا گیا تھا۔ شوکت سے کہا کہ وہ شرکت کرنے کے لیے تیار ہے۔ دونوں اکٹھے رہیں گے۔ چنانچہ فوراً

فلیٹ حاصل کر لیا گیا۔ کرایہ غالباً ایک سو پچھتر روپے یا دو سو روپے ماہوار تھا۔ فرنیچر اور دوسرے ساز و سامان سے چند دن کے اندر اندر یہ جہازی فلیٹ سجا دیا گیا۔ شوکت کا بیڈ روم سمندر کی طرف تھا۔

ادھر سے اگر پانچ سو قدم کا فاصلہ طے کیا جاتا تو نظامی کا فلیٹ آتا تھا۔ مطلب یہ کہ اب نور جہاں اور شوکت میں صرف اتنے ہی قدموں کا فاصلہ باقی رہ گیا تھا۔

میرے ذمے جو کام تفویض کیا گیا تھا، وہ میں خوش اسلوبی سے نبھا رہا تھا۔ کبھی کبھی نظامی کے ہاں جا نکلتا تھا۔ اور اگر نور جہاں موجود ہوتی تو اس کو بتا دیتا تھا کہ شوکت نے کتنی آہیں اس کے لیے بھری ہیں اور رات کو پینے کے بعد وہ کتنی مرتبہ اس کے فراق میں رویا ہے۔

نور جہاں کو میرے ذریعے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ شوکت اس کے پڑوس ہی میں مقیم ہے اور یہ کہ صرف پانچ سو قدم ساحل کے ساتھ چل کر وہ اس کے پاس پہنچ سکتی ہے، یا وہ اس کے پاس ——— سیر کی سیر اور دیدار یار بھی۔

میں نے کئی دفعہ محسوس کیا کہ یہ کام جو میں کر رہا ہوں کسی بوڑھی کٹنی کا ہے۔ مگر دوست کے لیے آدمی کیا کچھ نہیں کرتا ———؟

یہاں میں آپ پر یہ واضح کردوں کہ میں دونوں کی شادی کے سخت خلاف تھا۔ ایکٹرس سے شادی کا سلسلہ ہی میرے نزدیک غلط بات ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہیں، بس ٹھیک ہے۔ جب اُکتا جائیں تو اپنا اپنا راستہ لیں —— مگر شوکت پٹہ لکھوانے کا قائل تھا کہ زمین ساری عمر اُسی کی ملکیت رہے۔ میں نے اُسے بہت سمجھایا۔ وہ مان گیا، کہ اگر نورجہاں سے اس کا ملاپ ہو گیا تو وہ شادی نہیں کرے گا۔

مجھے جو کرنا تھا، کر چکا تھا۔ میں اب اپنی کہانی کا جس کا عنوان "نوکر" تجویز ہوا تھا، منظرنامہ لکھنے میں بے طرح مصروف تھا۔ اس کے علاوہ کیڈل روڈ اور بائی کلہ میں کئی میل حائل تھے، اس لیے شوکت کے ہاں میرا آنا جانا کم ہو گیا۔

ان دنوں اچھی بیئر نایاب تھی۔ اتفاق سے امریکی بیئر کی چار فربہ اندام بوتلیں مجھے مل گئیں۔ میں یہ ساتھ لے کر کیڈل روڈ پہنچا۔ صبح کا وقت تھا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ مشروب ناشتے ہی سے شروع کیا جائے۔

جب وہاں پہنچا تو دیکھا کہ فلیٹ سنسان ہے۔ نذیر لدھیانوی نہا دھو کر اور ناشتہ کر کے دفتر روانہ ہو چکا ہے اور

شوکت سو رہا ہے۔

میں اس کی خوابگاہ کے پاس پہنچا اور دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ پھر ذرا زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے شوکت کی خواب آلود آواز آئی ۔۔ "کون ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "منٹو"

شوکت نے کہا۔ "ٹھہرو!"

میں ٹھہرا رہا۔ تین منٹ کے بعد دروازہ کھلا۔ کمرے کے اکلوتے پلنگ پر نور جہاں لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے اس کو دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔ "انقلاب زندہ باد۔"

نور جہاں کی آنکھیں ایسے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی وہ لانڈری سے دھل کے آئی ہیں۔ میں نے شوکت کو دیکھا کہ وہ کسی قدر مضمحل تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "تو چتوڑ گڑھ فتح ہو گیا۔"

شوکت مسکرا دیا۔ اس کی یہ مسکراہٹ اطمینان بھری تھی۔ کہنے لگا۔ "آؤ بیٹھو!"

میں ان کے پلنگ کے پاس ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پر بیٹھ گیا اور شوکت سے مخاطب ہوا ۔۔ "کیوں بھائی! یہ محترمہ کیسے تشریف لائیں؟"

شوکت نے فاتحانہ نظروں سے نور جہاں کو دیکھا جو پلنگ

پر چادر سے خود کو اچھی طرح ڈھانپ رہی تھی ــ رولبس کچے
دھاگے سے بندھی آئی ہیں۔"

معلوم نہیں وہ کچے دھاگے سے بندھی آئی تھی یا پکے
دھاگے سے بندھی آئی تھی۔ پر میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں
کہ وہ دھاگہ جیسا بھی تھا اس کی تخلیق ہاتھوں سے نہیں، دلوں
سے ہوئی تھی۔ بڑے عمدہ طریقے سے بٹا ہوا تھا، ورنہ وہ پانچ
سو قدموں کا فاصلہ اتنی جلدی اور اتنی خوبی سے پاٹا نہیں
جا سکتا تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ شوکت کے بیڈروم میں جس فرنیچر کی کمی
تھی، وہ پوری ہو گئی تھی۔ــ اور اب وہ مکمل طور پر سج گیا تھا۔
لیکن اُدھر نظامی کے فلیٹ میں ایک بتّی بجھ گئی تھی۔ وہ بتّی
جو ایک پورے بجلی گھر میں تبدیل ہو سکتی تھی۔

نظامی نے اسے بہت سمجھایا بجھایا، بھائیوں نے اسے
بہت دھمکیاں دیں، پر جب عشق کا بھوت سر پر سوار ہو
تو کانوں کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ دھمکیاں
اور بھبکیاں، پند و نصائح قطعاً اثر انداز نہیں ہوتے۔

شوکت نے مجھ سے کہا۔ "منٹو! میرا خیال ہے، میں سالی
سے شادی کر ڈالوں۔"

میں نے پھر اس سے کہا: "یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم

اس کے مالک ہو، لیکن میری ایمان دارانہ رائے یہی ہے کہ تمہارا یہ اقدام درست نہیں ہوگا۔ کیا تم نے اس بارے میں اپنے گھر والوں سے مشورہ کیا ہے؟"

اس سوال کا جواب شوکت گول کر گیا۔ بہرحال اب مجھے یقین تھا کہ وہ اب سوچ سمجھ کر قدم اٹھائے گا اور عجلت سے کام نہ لے گا۔

بمبئی میں ایک بزرگ حکیم ابو محمدؐ طاہر اشک عظیم آبادی کے نام سے تھے۔ یہ ایک عجیب شے تھے۔ عمر آپ کی پچھتر برس کے قریب تھی، مگر دل جوان تھا۔ آنکھوں کی بینائی بالکل درست تھی۔ دانت سلامت تھے۔ ہر نئے فلم کا پہلا شو دیکھتے تھے۔ پانچ زبانیں بولتے تھے۔ اردو، فارسی، عربی، انگریزی اور پنجابی۔ بڑے معرکے کے آدمی تھے۔ طبابت سے شغف تھا اور شعر و شاعری سے بھی۔ شوکت سے میں نے ان کی ملاقات کرائی تو وہ ان کے گرویدہ ہو گئے۔ اور ان کو چچا جان کہنے لگے۔

حکیم صاحب نے ان سے دور دراز کا کوئی رشتہ بھی پیدا کر لیا تھا۔ ان کے کہنے کے مطابق وہ شوکت کے خاندان سے بہت پرانے مراسم رکھتے تھے۔

جیسا کہ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں، شوکت کے

ہاں میرا آنا جانا بہت کم ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ بائی کلہ اور کیڈل روڈ میں فاصلہ کافی تھا۔ اس کے علاوہ میں کہانی کی منظر نویسی میں مشغول تھا۔ چند دن گزرے تو حکیم صاحب تشریف لائے۔ مجھے ان سے بڑی عقیدت تھی کہ میری زبان درست کرنے میں آپ نے غیر شعوری طور پر میری بہت مدد کی تھی۔ ان کو بھی مجھ سے محبت تھی کہ میں ان کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ باتوں باتوں میں آپ نے مجھے بتایا کہ شوکت بیٹے کا نکاح نورجہاں سے ہو گیا ہے۔ میں بہت حیران تھا کہ مجھے اس کی خبر تک نہ ہوئی۔

جب میں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا تو حکیم صاحب نے سارا معاملہ گول کرنے کی کوشش کی۔ جب ناکام رہے تو انھوں نے مجھ سے کہا۔ "دیکھو سعادت! یہ سب کچھ خفیہ طور پر ہوا ہے تاکہ لوگوں میں چرچا نہ ہو۔ میں نے تم سے ذکر کر دیا کہ تم بھی شوکت کی طرح میرے بیٹے ہو، اس لیے یہ راز راز ہی ہے۔"

یہ راز کب تک راز رہ سکتا تھا؟ میں پچھتر برس کے بڈھے سے کیا بحث کرتا! غصہ تو مجھے صرف اس بات کا تھا کہ شوکت نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائے رکھی؟ اگر اسے نکاح کرنا ہی تھا تو میری شمولیت اس میں کیوں ضروری نہ سمجھی؟

اور مجھے کیوں تاش کی گڈی میں سے جوکر سمجھ کر الگ کر دیا گیا۔
۔۔۔ میرے دل میں تکدّر تھا، لیکن شوکت سے میں نے اس کا ذکر نہ کیا کہ اس سے میرے اور اس کے تعلقات یقیناً کشیدہ ہو جاتے۔

دن گزرتے گئے۔

نظامی تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ سیّد کمال حیدر امروہوی نے ہزار ہا مرتبہ ٹیلی فون کیا۔ سینکڑوں مرتبہ اپنی سیکنڈ ہینڈ کار میں نظامی کے فلیٹ کے چکّر کاٹے، آخر وہ بھی نا امید ہو کر دیگر مشاغل میں مصروف ہو گیا۔

شوکت کا بیڈ روم آباد تھا۔ وہاں ہنسی کے چھینٹے اُڑتے تھے۔ نور جہاں کے گلے سے نور برستا تھا۔ رفیق غزنوی سے جس قسم کی دُھنیں بنوانی ہوتی تھیں، ان کی ریہرسل ہوتی تھی۔ دو جوانیاں کیڈل روڈ کے اس فلیٹ میں کُھل کھیل رہی تھیں۔

میں آپ کو ایک لطیفہ سناؤں۔

میرے بھائی جان! سعید حسن بیرسٹر، جزائر فجی سے ایک مدت کے بعد امرتسر جانے کے لیے تشریف لائے۔ انھوں نے مجھے اطلاع دی کہ وہ بذریعہ ہوائی جہاز آ رہے ہیں۔ ان دنوں میں مَیں ماہم میں رہتا تھا اور ہمارا فلیٹ بہت ہی چھوٹا تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا۔ مصوّر کے

ایڈیٹر نذیر لدھیانوی بھی موجود تھے۔ طے یہ پایا کہ ان کو اُس فلیٹ میں ٹھہرایا جائے جہاں نذیر اور شوکت دونوں اکٹھے رہتے ہیں۔

یہ فلیٹ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، بہت بڑا تھا۔ نذیر چھڑا چھٹانک تھا۔ شوکت تنہا، اس کی نورجہاں تھی۔ ان کو تو بس فقط ایک بیڈ روم چاہیئے تھا۔ باقی کمروں سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے بھائی جان کے لیے جو یورپی طرزِ رہائش کے عادی تھے۔ ایک علیحدہ کمرے اور غسل خانے کا انتظام بڑی آسانی سے ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جب وہ بمبئی تشریف لائے اور چند روز کے لیے وہاں رُکے تو میں انہیں کیڈل روڈ پر لے گیا۔

وہ یہ فلیٹ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ عمارت قریب قریب نئی تھی، جدید طرز کی، دو منزلہ تھی۔ اوپر کی منزل میں صاحبِ مکان رہتے تھے۔ پچھلی طرف یعنی جدھر سمندر کا ساحل تھا، کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا بغیچہ تھا۔ اس میں بچوں کے کھیلنے کے لیے جھولے تھے اور وہ جنہیں انگریزی میں "سی سا" کہتے ہیں اور وہ پھسلنے والے تختے!

سمندر کی مرطوب ہوا ہر وقت آتی رہتی تھی۔ بعض اوقات

یہ اس قدر تیز ہو جاتی تھی کہ فلیٹ کے وہ تمام دروازے، وہ تمام کھڑکیاں، جن کا رُخ سمندر کی طرف تھا، بند رکھنا پڑتی تھیں کہ چیزیں اپنی جگہ سلامت رہیں۔

اس فلیٹ میں بھائی جان اپنے مختصر سے اسباب کے ساتھ اُترے اور بہت خوش ہوئے۔ لیکن چند ہی روز میں ایک ٹریجیڈی وقوع پذیر ہو گئی۔

شوکت نورجہاں کو دوبارہ پا کر بہت خوش تھا۔ اس خوشی کا انکاس کسی نہ کسی طرح نفسیاتی طور پر ہونا ہی چاہیئے تھا۔ پھر مرزا مشرف تھا، شوکت کی دیگ کا بہت بڑا چمچہ، چاولہ تھا، سہگل تھا اور دوسرے تھے جو شوکت کے فلم میں شریک ہونے کے لیے بے قرار تھے۔

فلمی دنیا دراصل رات کی دنیا ہے۔ دن بھر یہ سب اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہتے تھے اور سرِشام شوکت کے ہاں جمع ہو جاتے تھے۔ وسکی کے دور چلتے تھے، سوقیانہ قسم کی ہنسی ٹھٹھے ہوتے تھے۔ گانے گائے جاتے تھے۔ کہانیاں سنائی جاتی تھیں اور بعض اوقات تو اتنا شور برپا ہوتا تھا کہ اوپر کی منزل والوں کو پکار پکار کر کہنا پڑتا تھا کہ بابا خاموش رہو۔

ایک رات شوکت نے غالباً ایم۔ اے مغل کو جو

پری چہرہ نسیم بانو کے ڈھنڈورچی کی حیثیت سے مشہور تھے۔ اپنے ہاں مدعو کیا۔ مرزا مشرف بھی تھے، میں بھی تھا اور میری بیوی بھی تھی۔ دعوتِ طعام سے فارغ ہو کر میں اور میری بیوی تو فوراً چلے گئے کہ ہمیں ایک ضروری کام سے کہیں جانا تھا۔ بھائی جان شوکت علی کے بیٹے زاہد کے ہاں مدعو تھے۔ وہ دیر سے لوٹے۔ مگر جب انھوں نے ہال میں قدم رکھا تو دیکھا کہ زندی و سرمستی اپنے بال کھولے ناچ رہی ہے۔ وہ ہاؤ ہُو ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ معلوم نہیں، انھوں نے اور کیا کچھ دیکھا کہ صبح ہوتے ہی اپنا سامان بندھوا کر خلافت ہاؤس چلے گئے۔ اور مجھے اور میرے دوستوں کو اس قدر تند و تیز لہجے میں بُرا بھلا کہا کہ اب میں نے اس واقعہ کو یاد کیا ہے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ اُتر رہا ہے۔

انھوں نے اصل میں اپنی ساری زندگی قانون کی کتابوں میں گزاری تھی۔ ساری عمر مقدمے لڑتے رہے تھے۔ لاہور میں، بمبئی میں، مشرقی افریقہ میں اور جزائر فجی میں۔ ان کو کیا معلوم کہ فلمی دنیا کیا ہوتی ہے؟ اور اس کے عاشق و معشوق کس قسم کے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ

سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ اور خلافت ہاؤس میں جا کر پناہ لی۔ پر لطف کی بات یہ ہے کہ یہ خلافت ہاؤس ایک ایسی گلی میں واقع ہے جس کا نام "لَو لین" ہے۔ یعنی محبت کی گلی ہے۔

یہ قصہ تو خیر ضمناً آ گیا کہ زیبِ داستان کے لیے ضروری تھا۔ اب میں نورجہاں کی طرف لَوٹتا ہوں۔ جس کی بڑی بہن وہیں کیڈل روڈ پر پاس ہی اپنے بھائی کے ذریعے سے پیشہ کراتی تھی مگر پرائیویٹ طور پر ــــ مجھے معلوم نہیں کہ یہ دونوں بہنیں آپس میں ملتی تھیں یا نہیں، لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں، شوکت نے اس کی اجازت نورجہاں کو کبھی نہ دی ہوگی۔

نورجہاں کا بھائی پہلے درجے کا جواری تھا۔ سٹہ کھیلتا تھا۔ تاش کے پتّوں پر داؤ لگاتا تھا۔ ریسوں میں جاتا تھا۔ اس کو ظاہر ہے کہ نورجہاں اور شوکت کا ملاپ سخت شاق گزرا تھا۔ جیسا کہ میں اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں۔ اس نے چچا نظامی سے مل کر بہت کوشش کی کہ وہ پھر ایک دوسرے سے جُدا ہو جائیں اور نورجہاں ان دونوں کی روزی کا ٹھیکرہ بن جائے۔ مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھی۔

شوکت کو ہر قسم کی دھمکیاں دی گئیں مگر وہ بھی ایک دبنگ آدمی ہے، اس نے ان کی کوئی پروا نہ کی اور نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ یہ محاذ بالکل خاموش ہو گیا۔

فلم "نوکر" کی شوٹنگ جاری تھی۔ رفیق اس کی موسیقی مرتب کر رہا تھا۔ بظاہر وہ اپنے کام میں پورے انہماک سے دلچسپی لیتا تھا، مگر میں صاف محسوس کرتا تھا کہ رفیق غزنوی ہر وقت الجھن سی محسوس کرتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی عین ناک کے نیچے (یہ بھی انگریزی محاورہ ہے) ایک اور شخص اس لونڈیا کو اڑا لے گیا تھا جس پر اس کی عشق پیشہ آنکھ تھی۔

بہر حال فلم "نوکر" کی تکمیل افتاں وخیزاں جاری تھی۔ اس دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ شوکت فلم سازی کے معاملے میں بے حد متلوّن مزاج ہے۔ اس کو ایک آدمی کا کام پسند نہیں آتا۔ بلکہ یوں کہیئے کہ اس کو فقط ایک آدمی کے کام سے اطمینان نہیں ہوتا۔ میں نے اس کو کہانی کا منظر نامہ معہ مکالموں کے لکھ کر دے دیا تھا۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ وہ خفیہ طور پر کئی آدمیوں سے مکالمے لکھوا رہا ہے۔ ان میں ہمارے بزرگ اشکؔ عظیم آبادی بھی تھے۔ مجھے بہت تاؤ آیا۔ جہاں تک اشکؔ صاحب کا

تعلق تھا، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ مگر دوسروں کو میں قطعاً برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے بڑے گرم الفاظ میں شوکت سے اپنی شکایت کا اظہار کیا۔ آدمی سمجھ دار ہے۔ حکمتِ عملی سے کام لے کر اُس نے میرے دماغ پر برف کی کئی سِلیں رکھ دیں۔ مگر میں دل برداشتہ ہو چکا تھا کیونکہ کہانی بھی میری مرضی کے مطابق نہیں لکھی گئی تھی۔ اور اس کے ہر کونے اور ہر موڑ پر شوکت نے اپنی من مانی کی تھی۔

میں بڑا ہٹ دھرم اور ضدّی آدمی ہوں، لیکن شوکت کے سامنے میری کوئی پیش نہ چلتی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے چند دن اس کے ساتھ کام کر کے قطعی طور پر جان لیا تھا کہ یہ شخص جو میرے ساتھ ہرن مارکہ وسکی اور کریون اے کے سگریٹ پیتا رہا ہے اور میری ہر بات مانتا رہا ہے۔ فلم سازی کے معاملے میں وہی کچھ کرے گا جو اس کا گھڑی ساز دماغ مناسب سمجھتا ہوگا۔ چنانچہ یہی ہوا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ دبے پاؤں فلم "نوکر" کی پروڈکشن سے باہر نکل جاؤں گا۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ شوکت چونکہ میرے اَڑیل مزاج سے واقف تھا۔ اس لیے اس نے میرے اس فرار کو سکون

کے لیے اچھا ہی سمجھا۔ کیونکہ بہت ممکن تھا کہ اگر میں کسی نکتے پر اڑ جاتا تو فلم کی شوٹنگ مہینوں تک کھٹائی میں پڑی رہتی۔

مجھے اس سے شکایت تھی۔ اس کو بھی اپنی جگہ یقیناً ہوگی۔ مگر ہمارے دوستانہ تعلقات میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں کہ ملک میں سیاسی گڑبڑ کے باعث فلم انڈسٹری کی حالت بالکل چھوئی موئی کی سی تھی۔ کسی نے اسٹول پر چڑھ کر "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ لگایا تو کئی فلموں کا اسقاط ہو جاتا تھا۔ یوں بھی ان دنوں جنگ کے باعث خام مال قریب قریب نایاب تھا۔ حالات چونکہ غیر یقینی تھے۔ اس لیے بہت کم فلم ڈائرکٹروں کی مالی حالت اچھی تھی۔ پروڈیوسروں کے پاس ایک گھڑا گھڑایا اور بہت معقول بہانہ موجود تھا کہ روپیہ کہاں سے لائیں؟ جنگ شروع ہے۔ آج کریٹ کی لڑائی ہے اور کل فن لینڈ کی۔ پرسوں جاپان کے حملے کا خطرہ ہے۔ مگر سچ پوچھیے تو یہی وہ زمانہ تھا کہ جب پروڈیوسروں اور سرمایہ لگانے والوں نے جھولیاں بھر بھر کے کمایا۔

شوکت کا اس دوران میں ایک اور جگہ کنٹریکٹ ہوا۔ غالباً سیٹھ نہ دبری (بمبئی میں جوہری کی بگڑی ہوئی شکل) سے —

یہ ایک بڑا بر خود غلط قسم کا انسان تھا۔ بڑے ادنے درجے سے تعلق رکھتا تھا، مگر جنگ نے اسے سیٹھ بنا دیا تھا۔ اب وہ کھُل کھیلنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک فلم کمپنی کھڑی کر دی تھی۔ دو چار موٹریں لے لی تھیں۔ اونچی جگہوں پہ تو اس کا ہاتھ نہ پہنچتا تھا مگر وہ ایکسٹرا لڑکیوں کو پھانسنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔

اس سیٹھ سے شوکت کا کنٹریکٹ ہوا۔ تو اس نے تین ہزار روپے پیشگی دیئے۔ میں شوکت کے ساتھ تھا۔ جب چیک کیش ہو گیا تو میں نے روپے اس سے لے لیے اور اس سے کہا۔ "چلو! ڈاک خانے چلیں۔"

ڈاک خانے پہنچ کر میں نے وہ روپے سب کے سب ہی شوکت کے گھر رجسٹری اور بیمہ کرا کے بھیج دیئے۔ میرا خیال ہے نورجہاں کو میری یہ حرکت یقیناً ناگوار گزری ہو گی۔ لیکن میرا اس سے کیا سروکار؟

اسی دوران میں شوکت کو میں نے مجبور کیا کہ وہ اپنی زندگی کا بیمہ کرا لے۔ وہ میری باتوں کو بہت کم رد کرتا تھا، فوراً مان گیا۔ چنانچہ دس ہزار روپے کی پالیسی لے لی گئی۔

معلوم نہیں میں یہ سب کچھ کیوں کر رہا تھا۔ میں اب سوچتا ہوں تو مجھے اپنی یہ سب باتیں اور یہ تمام حرکات بزرگانہ ہونے کے بجائے

طفلانہ معلوم ہوتی ہیں۔ صاف اوروں کو نصیحت اور خود میاں فضیحت والا معاملہ تھا۔

نورجہاں اب خوب نکھر گئی تھی۔ مرد کی قربت بھی عورت کے حُسن کے لیے کتنی ضروری ہوتی ہے ۔۔۔ اس کے جسم کے خطوط اب واضح شکل اختیار کر چکے تھے۔ وہ تمام خالی جگہیں جو لاہور میں پُر نہ ہوئی تھیں، یہاں بمبئی میں پُر ہو گئی تھیں۔ اور اس پر جسم کی لذتوں کے قریب قریب تمام اسرار منکشف ہو چکے تھے۔ نورجہاں گو اب بھی لوگوں کی زبان پر "بے بی نورجہاں" تھی۔ مگر وہ عشق و محبت کا جھولا جھول جھول کر ان تمام جھونٹوں سے آگاہ ہو چکی تھی جو اس کی رسیّوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔

ایک دن آؤٹ ڈور شوٹنگ تھی۔ بمبئی کے مضافات میں کسی کا ایک خوبصورت باغ تھا۔ جس کو شوکت نے منتخب کیا تھا۔ کیمرے کے لینس کے ساتھ ریڈ فلٹر لگا کر منظر کشی کرنا تھی کہ دن کی بجائے رات معلوم ہو اور جو دھوپ ہو وہ چاندنی نظر آئے۔

شوکت نے اصرار کیا کہ میں اس کے ساتھ ضرور چلوں۔ مجھے دیر ہو گئی۔ اس لیے میں سیٹھ ویاس کی گاڑی میں وہاں پہنچا۔ نورجہاں کو میں نے لوکیشن پر دیکھا تو میری آنکھوں کو زبردست دھکا لگا۔ عجیب و غریب لباس پہنے تھی۔ لباس کی

وضع قطع میرے لیے نئی نہیں تھی۔ معمولی شلوار قمیص تھی۔ مگر اس میں آنکھوں کے لیے بڑی خارش پیدا کرنے والی حدّت تھی۔ شلوار جالی کی تھی۔ جسے انگریزی میں "نٹ" کہتے ہیں۔ عام طور پر یہ کپڑا کھڑکیوں کے پردوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ معلوم نہیں یہ نور جہاں کی اپج تھی یا سید شوکت حسین رضوی کی۔ مگر وہ یہ لاکھوں کھڑکیوں والی شلوار پہنے تھی۔ جس میں اس کی ٹانگیں بغیر کسی تکلیف کے چھن چھن کے باہر آ رہی تھیں۔ قمیص بھی اسی کپڑے کی تھی۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیجیے کہ اس ملبوس نے نور جہاں کو ڈھانکنے کی کتنی کوشش کی ہو گی!۔

شوبھنا سمرتھ بھی موجود تھی۔ نور جہاں کو اس لباس میں دیکھ کر واللہ میں تو بوکھلا گیا تھا۔ ایسا لباس، پھر روشنی کے پیش منظر میں۔ میں نے اپنی زخمی نگاہیں ادھر سے ہٹائیں اور شوبھنا کے پاس چلا گیا۔ کہ وہ مستور تھی۔

شوبھنا سمرتھ تعلیم یافتہ عورت ہے۔ گفتگو کا سلیقہ رکھتی ہے۔ چونکہ اچھے مرہٹی خاندان کی ہے۔ اس لیے اس میں ہلکٹ پن (بمبئی کی زبان میں) نہیں۔ بڑی ہی باتمیز عورت ہے۔ وہ بھی اس فلم میں کام کر رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ گھاس کے ایک تختے پر بیٹھ گیا اور

اپنی وہ کوفت اور اپنا وہ تکدّر دور کرتا رہا جو نور جہاں کا گھڑکیوں والا لباس دیکھ کر میرے دل و دماغ میں پیدا ہوا تھا۔

جیسا کہ میں اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں۔ مجھے فلم "نوکر" سے کوئی دل چسپی نہیں رہی تھی۔ شوکت اپنی من مانی کر رہا تھا۔ اور میں اس میں دخل دینے سے کتراتا تھا کہ میرے اور اس کے تعلقات کہیں خراب نہ ہو جائیں۔

نور جہاں سے اس کے گھر میں کئی مرتبہ ملاقاتیں ہوئیں۔ میں نے اس کا حسب بھی اور زیادہ غور سے مطالعہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتی ہے، اسی کی خصوصیات اس میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس کی ہر ادا میں اور ہر حرکت میں ایک بناوٹی ادا تھی، ایک نخرہ تھا جسے سنجیدہ نگاہیں شاید ہی قبول کر سکیں۔

مجھے تعجب ہے، کہ سیٹھ شوکت ٹھیٹھ ہندوستانی (یعنی یو۔ پی۔ کا باشندہ) اور وہ ٹھیٹھ پنجابی،۔ ایک لحاظ سے 'جٹنی'، گاؤں کی مٹیار ـــــ لیکن دونوں بہت خوش تھے۔ شوکت پنجابی نما اردو بولنے کی کوشش کرتا اور وہ اردو نما پنجابی۔ خاصی دلچسپ چیز تھی۔

فلم "نوکر" ختم ہوئی تو شوکت اور میرے درمیان فاصلہ بڑھ گیا۔ وہ عشق کے جھولے جھول کر اب کاروباری دھندوں میں مشغول ہو گیا تھا، اور میں اپنے کاموں میں۔ گاہے گاہے کسی فلم کمپنی کے دفتر میں، یا سڑک پر اس سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ مگر وہ بھی چند منٹوں کی، خیر خیریت دریافت کی اور اپنی اپنی راہ لی۔

فلم انڈسٹری کی حالت اب بہتر تھی۔ جنگ کا خوف پروڈیوسروں کے سر سے اتر چکا تھا۔ اور فلم انڈسٹری کے تمام متعلقین کو معلوم ہو چکا تھا کہ یہ زمانہ کمانے کا ہے۔ چنانچہ لاکھوں روپے ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔

شوکت ذہین ہونے کے علاوہ کاروباری آدمی بھی ہے۔ چنانچہ اس نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور کچھ عرصے کے بعد اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کی اور ایک بڑا کامیاب فلم بنایا۔ یوں تو اس کی ساکھ پہلے ہی قائم تھی کہ فلم انڈسٹری کے لوگ اسے ایک قابل ڈائرکٹر اور ماہر اڈیٹر مانتے تھے لیکن جب اس نے اپنی ذاتی فلم کمپنی کھڑی کی تو انڈسٹری کے حلقوں میں اس کا وقار اور بھی بڑھ گیا۔

عام طور پر ڈائرکٹر یا پروڈیوسر فلمی دنیا میں کسی ایکٹریس سے صرف اس لیے شادی کرتے ہیں کہ وہ ان کی کشتیٔ حیات میں پتوار کا کام دے۔ معلوم نہیں شوکت نے نورجہاں سے کیا اسی مقصد کے پیش نظر شادی کی تھی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ اس سے شادی نہ بھی کرتا تو بھی اس کی آمدنی میں روز افزوں ترقی ہوتی رہتی۔ اس لیے کہ وہ اپنے فن کو جانتا ہے اور پھر مزدوروں کی طرح مشقت کر سکتا ہے۔

مجھے معلوم نہیں، شوکت بمبئی کو چھوڑ کر پاکستان کیوں آیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ بڑا کٹر قسم کا مسلمان ہے۔ اگر وہاں بمبئی میں کسی نے مسلمانوں کے خلاف ایک جملہ بھی کہہ دیا ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ اس کی کھوپڑی پیچ کش سے کھول دیتا اور اس کی اصلاح کرنے کی ناکام کوشش کرتا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نورجہاں نے اسے مجبور کیا ہو کہ اسے لاہور بہت پیارا ہے۔ کیونکہ پنجابیوں کے کہنے کے مطابق۔ "لاہور لاہور ہے"۔

بمبئی میں وہ بہت کامیاب تھا۔ اس نے ایک دو فلم ایسے بنائے تھے جن سے اس کی دھاک بیٹھ گئی تھی، وہ کروڑوں روپے وہاں پیدا کر سکتا تھا۔

لیکن اس نے پاکستان کو اپنا گھر بنایا۔ اس کا گھڑ ساز دماغ جو سوئی کی ایک خفیف سی غلط حرکت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یہاں پاکستان کی فلم انڈسٹری کے لیے جو حالتِ نزع میں تھی، کام آیا۔

اس نے شوری کا جلا ہوا، سڑا ہوا، نہایت شکستہ، اسٹوڈیو حاصل کیا اور اسے ایک اعلےٰ ترین نگار خانے میں تبدیل کر دیا۔

آپ میں سے بہت کم حضرات جانتے ہوں گے کہ شاہ نور اسٹوڈیو میں جو بھی کیل ٹھکی ہے، اس میں شوکت حسین رضوی کا ہاتھ ہے۔ جو پیچ لگا ہے، اس پر شوکت کے پیچ کش کا نشان ہے۔ وہاں چھوٹے سے بوٹے سے لے کر لیبارٹری کی بھاری بھرکم مشینری تک سب اس کے ہاتھ کی لگی ہے۔

یہ بہت بڑا وصف ہے۔۔۔ اتنا بڑا کہ اس کے اور دوسروں کے لیے نقصان وہ ثابت ہوا ہے۔ ہر بات میں عملی طور پر دخل دینے سے اس نے کئی گڑبڑ گھوٹالے (بمبئی کی زبان میں) کیے ہیں۔ یوں وہ بڑے ٹھاٹ سے رہتا ہے۔ لیکن میں آپ کو ایک پُر لطف قصہ سناتا ہوں۔

یہاں لاہور میں آکر بھی وہ میرا دوست ہے۔ اکثر میری مدد کرتا رہا ہے۔ ایک بار میں اس کے پاس گیا۔ اس کی بے داغ سفید قمیص کے بٹن موجود نہیں تھے۔ میں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔ کہ یہ کیا قصہ ہے ؟
اس نے مسکرا کر کہا، "کیا بتاؤں یار —— پیسے ہی نہیں کہ بٹن خرید سکوں۔"

جب میں نے اس سے سگریٹ طلب کیا تو اس نے مجھے بتایا کہ دس روز سے وہ سگریٹ ادھار لے رہا ہے ——

یہ اس شخص کی حالت تھی جس کے اسٹوڈیو میں لوگوں کو ریفریجیٹر کا ٹھنڈا پانی ملتا ہے۔ جہاں پر پھول کھلتے ہیں۔ جہاں کئی مالی کام کرتے ہیں۔ جہاں سینکڑوں مزدور ہیں۔ جہاں نورجہاں ہے، جو اعلےٰ سے اعلیٰ کپڑے پہنتی ہے۔ اور موٹروں میں گھومتی ہے۔

نورجہاں کے متعلق کئی افواہیں مشہور ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ حقیقت پر مبنی بھی ہوں۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ دو نہایت پیارے بچوں کی ماں ہے جو چیفس کالج کے صاف ستھرے ماحول میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور وہ ان سے پیار کرتی ہے۔

پچھلے دنوں چیفس کالج میں ایک جلسہ تھا جس میں چند ننھّے منّے بچوں نے حصہ لیا تھا۔ اس میں ایک ڈانس تھا، رادھا کرشنا ڈانس۔ نور جہاں کا بڑا لڑکا ایک گوپی بنا ہوا تھا۔ اس نسوانی لباس میں وہ بہت پیارا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا رقص بھی بہت خوب تھا۔

نور جہاں یقیناً رقص جانتی ہے۔ معلوم نہیں اس نے اپنے اکبر کو خود تعلیم دی ہے یا وہ خود بخود خون کے ذریعے سے یہ سب کچھ سیکھا ہے۔ بہرحال اب دیکھنا یہ ہے کہ اکبر اور اصغر جو کہ چیفس کالج میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، آگے چل کر کیا بنتے ہیں؟

کیا یہ بیری موروں اور بہقوی راجوں کا خاندان بنے گا؟ — فی الحال ہم اس کے متعلق کیا کچھ کہہ سکتے ہیں؟

نور جہاں ذرا بد دماغ ہے۔ اس کو اپنے حسن پر تو ناز نہیں ہونا چاہیئے کہ ایسی کوئی چیز اس میں نہیں ہے۔ ایک فقط آواز ہے، گلا ہے، جو نور سے بھرا ہے۔ اس پہ اگر اسے ناز ہے تو بجا ہے۔ مگر بد دماغ ہونے کا پھر بھی کوئی صحیح جواز نہیں۔

مجھے یاد ہے، ایک مرتبہ میری بیوی نے بمبئی میں مجھ سے کہا۔ "آپ نور جہاں کو جانتے ہیں۔ وہ ہمارے گھر کئی مرتبہ

آچکی ہے۔ کیا وہ اب نہیں آسکتی۔ میری چند سہیلیاں اس سے ملنا چاہتی ہیں۔"

میں نے اس سے کہا۔" کیوں نہیں آسکتی۔ ہزار مرتبہ آسکتی ہے۔"

میں نے شوکت سے کہا تو اس نے دوسرے ہی روز اسے بھیج دیا۔ میں نے بہت سی ایکٹرسیں دیکھی ہیں۔ بڑے اونچے پائے کی، بہت مشہور، بہت معروف، مگر ان میں مجھے وہ تکلف نظر نہ آیا جو نورجہاں میں ہے۔ وہ بنتی ہے۔ اس کی مسکراہٹ، اس کی ہنسی، اس کا سلام، اس کی مزاج پرسی، سب مصنوعی ہوتی ہے۔ معلوم نہیں یہ چیز اس کی طبیعت میں کیسے داخل ہوئی۔ بعض اوقات جب میں اس کی اور شوکت کی ازدواجی زندگی کا تصور کرتا ہوں تو مجھے وہ بھی مصنوعی سی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن بخدا کا شکر ہے کہ ایسی نہیں!۔

نورجہاں آئی، سب سے بڑے پرخلوص، تپاک سے، جسے میں اب بھی مصنوعی سمجھتا ہوں، ملی۔ میں تو چاہتا تھا کہ عورتوں کو چھوڑ کر چلا جاؤں کہ وہ آزادانہ طور پر گفتگو کرسکیں گی۔ مگر میری بیوی کی ایک سہیلی نے اصرار کیا کہ میں موجود رہوں اور نورجہاں سے کہوں کہ وہ گانا گائے۔

چنانچہ میں نے فوراً بڑے بے تکلف انداز میں نورجہاں سے کہا کہ بھئی ایک دو گانے ہو جائیں کہ یہ لوگ تمہاری آواز کا "زندہ ناچ و گانا" سننا اور دیکھنا چاہتی ہیں۔

نورجہاں نے ایک پُر تکلف ادا سے جواب دیا۔ "نہیں منٹو صاحب! پھر کبھی ——— میرا گلا ٹھیک نہیں۔"

میں کباب ہو گیا۔ اس کا گلا بالکل ٹھیک تھا۔ اس کا گلا فولاد کا گلا ہے جو کبھی خراب ہی نہیں ہو سکتا۔ صریحاً نخرے کر رہی تھی۔ میں نے اس سے پھر کہا۔ "نورجہاں! یہ بہانہ نہیں چلے گا ——— تمہیں گانا پڑے گا۔ میں تو تمہیں ہزار مرتبہ سن چکا ہوں۔ مگر ان لوگوں کو اشتیاق ہے، اس لیے تمہیں اچھے برے گلے کے ساتھ ہی گا دینا چاہیئے۔"

بہت دیر تک اُدھر سے انکار، اِدھر سے اصرار ہوتا رہا۔ میری بیوی نے کہا، جانے دو، جب وہ نہیں گانا چاہتیں تو آپ اس قدر زور کیوں دیتے ہیں۔ مگر... میں بھی ایک ضدی ہوں، نورجہاں کے پیچھے پڑ گیا۔ آخر اس کو فیضؔ کی وہ غزل گانی پڑی۔ ؎

آج کی رات سازِ دل پُر درد نہ چھیڑ

کم بخت نے کیا دھن بنائی تھی اور کیا آواز تھی کہ اب

اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی میرے کان اس شہد بھری آواز کو سُن سکتے ہیں۔

نورجہاں کے کئی عاشق ہوں گے۔ میں ایسے کئی باورچیوں کو جانتا ہوں جو چولھے کے پاس نورجہاں کی تصویریں لگا کر اپنے صاحبوں اور میموں وغیرہ کا کھانا پکاتے ہیں اور اس کے گائے ہوئے گیت اپنی گن سُری آواز میں گاتے ہیں۔

گھروں کے ان نوکروں کو بھی میں جانتا ہوں جو نمّی، نرگس اور کامنی کوشل کو پسند نہیں کرتے لیکن نورجہاں کے والہ و شیدا ہیں۔ جہاں کہیں اس کی تصویر مل جائے، کاٹ کر اپنے ٹوٹے ہوئے ٹرنک میں رکھ لیتے ہیں۔ اور فرصت کے وقت دیکھ دیکھ کر اپنی آنکھیں سینکتے ہیں۔ اور نورجہاں کو اگر کوئی بُرا کہے تو لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

اور میرے گھر میں اس کا ایک عاشق زار موجود ہے۔ وہ ہر خوبصورت لڑکی، ہر دلہن، ہر سرخپوش عورت کو نورجہاں کہتا ہے۔ اس کو نورجہاں کے گائے ہوئے گانے قریب قریب سب یاد ہیں۔ وہ خود بھی بڑا حسین ہے لیکن جانے اسے نورجہاں کی کون سی ادا بھا گئی

ہے کہ وہ دن رات اسی کا ذکر کرتا ہے۔

وہ میرا قریب ترین عزیز ہے۔ میری سالی اور میرے بھانجے کا لڑکا ہے۔ اس کا نام شاہد جلال ہے۔ ہم سب اسے پیار سے ٹاکو کہتے ہیں۔ اس کو ہم سب بہت سمجھا بجھا چکے ہیں کہ دیکھو تم نورجہاں کا خیال چھوڑ دو۔ وہ ایک بیاہتا عورت ہے۔ جس کے کئی بچے ہیں۔ تمہاری اور اس کی شادی نہیں ہو سکتی۔ مگر وہ نہیں مانتا۔

فلم دیکھتا ہے لیکن اگر اس میں نورجہاں نہ ہو تو اُسے بہت کوفت ہوتی ہے۔ یہ کوفت وہ گھر آکر نورجہاں کے گائے ہوئے گانے گا کر دُور کرتا ہے۔ اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے کہتا ہے کہ مجھے اور کوئی نہیں چاہیئے، صرف نورجہاں چاہیئے۔

پچھلے دنوں اس کے دادا میاں جلال دین، شوکت رضوی کے پاس گئے تھے اور انھوں نے اس سے کہا تھا کہ دیکھو! تمہاری بیوی کا ایک عاشق پیدا ہو گیا ہے جو بُری طرح اس پر لٹو ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کسی روز نورجہاں کو لے اُڑے اور تم منہ دیکھتے رہ جاؤ۔

وہ بہت حیران ہوا۔ اس لیے کہ میاں صاحب موصوف نے یہ بات شوکت کو بتائی تھی۔ پہلے تو وہ جھینپا ———

پھر اس نے پوچھا۔ "میاں صاحب! وہ کون شخص ہے؟"
میاں صاحب نے مسکرا کر اس سے کہا۔ "میرا پوتا۔"
"آپ کا پوتا؟ — کیا عمر ہے اس کی؟"
میاں صاحب نے جواب دیا — "یہی! چار برس کے قریب — !"

یہ حال ہی کی بات ہے۔ نور جہاں نے جب یہ ساری بات سنی تو بہت محظوظ ہوئی۔ اس نے کہا۔ "میں خود اپنے عاشق کے پاس جاؤں گی اور اس سے شادی کر لوں گی"۔
شاہد جلال بہت خوش ہے۔ وہ اس دن کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہا ہے۔ جب نور جہاں خود اس کے پاس چل کر آئے گی۔ اور وہ اسے اپنی دلہن بنا لے گا۔

پچھلے دنوں نور جہاں کے ایک اور عاشق کا قصّہ سننے میں آیا تھا۔ مگر وہ چار برس کا نہیں تھا۔ اچھا خاصا جوان تھا اور غالباً نائی یعنی حجام تھا۔ ہر وقت اس کے گائے ہوئے گانے گاتا رہتا تھا اور اسی کی باتیں کرتا تھا۔ ایک آدمی نے اُس سے کہا۔ "کیا واقعی تمہیں نور جہاں سے محبّت ہے؟"
حجام نے بڑے پُر خلوص انداز میں اسے جواب دیا:۔

"اس میں کیا شک ہے۔"
اس کے دوست نے اس کا امتحان لینا چاہا۔" اگر تمہیں اس سے سچی محبت ہے تو کیا مہینوال کی طرح تم اس کے لیے اپنا گوشت دے سکتے ہو؟ کہ کباب بنا کر اسے بھیجے جائیں؟"
حجام نے تیز استرا نکال کر اپنے دوست کے ہاتھ میں دے دیا اور اپنے دوست سے کہا۔" جہاں سے چاہو، تم میرا گوشت کاٹ لو۔"
اس کا دوست بھی معلوم نہیں، کس قسم کا انسان تھا۔ کہ اس نے اس کے بازو سے پاؤ بھر گوشت کا ٹکڑا اُسترے سے کاٹ کر الگ کر دیا اور خود بھاگ گیا، کہ حجام صاحب اس قربانی کے بعد خون کے بہاؤ کے باعث بے ہوش ہو گئے۔
اس عاشقِ زار کو جب میو ہسپتال میں داخل کیا گیا اور جب اس کو تھوڑا سا ہوش آیا تو اس کی زبان پر نور جہاں کا نام تھا۔
شوکت حسین رضوی کی بیگم اور دو بچوں کی ماں نور جہاں کا تازہ عشق بہت رسوا کن ثابت ہوا ہے۔ واقف کار حلقوں کا بیان ہے کہ نور جہاں ایک عرصے سے کرکٹ کے مشہور کھلاڑی نذر محمد کی

جوانی اور وجاہت سے بے حد متاثر نظر آتی تھی۔ اُن کی ملاقاتیں اکثر شک وشبہ کی نظروں سے دیکھی جاتی تھیں۔ اور بارہا ان ملاقاتوں کی وجہ سے شوکت اور نور جہاں کی مقابل زندگی میں شدید بدمزگی پیدا ہو چکی تھی۔ اس جوڑے کے حالات سے دلچسپی رکھنے والے (اور شاید خود شوکت بھی) ممکن ہے اس کے رومان کو اس لیے وقعت نہ دیتے ہوں کہ اب وہ دو بچوں کی ماں بن چکی ہے اور زندگی کے متعدد پُر شباب سال شوکت کی بیوی کی حیثیت سے بسر کر چکی ہے، خود بخود سنبھل جائے گی۔ کہ میاں بیوی کی زندگی میں ایک عورت نے داخل ہو کر قیامت برپا کر دی۔ شاہ نور اسٹوڈیو میں ایک نئی لڑکی نگہت سلطانہ ایکٹریس بننے کے لیے آئی۔ شوکت اس کے حسن وجمال سے بے حد متاثر ہوا۔ اور نور جہاں ان دونوں کی باہمی دلچسپی سے سوتیاہ ڈاہ محسوس کرنے لگی۔ چنانچہ معاملہ جب کچھ اور آگے بڑھا تو تصور کی جیتی نور جہاں نے ایک دن اسٹوڈیو میں ہی نگہت سلطانہ کو چٹیا سے پکڑ کر امریکن فری اسٹائل کے ایسے ایسے ہاتھ دکھائے کہ اگر ہیروئن اور شوکت حسین کی محبوبہ بن کر شاہ نور اسٹوڈیو پر حکومت کرنے کے خواب دیکھنے والی اس ایکٹریس کے ایک دو ہمدرد ہمت سے کام لے کر اسے نور جہاں کے پنجوں سے نہ چھڑاتے، تو اس روز شاہ نور اسٹوڈیو میں نئی ہیروئن کا جنازہ ہی دھوم دھام سے نکلتا۔

اس حادثہ سے بچ نکلنے کے بعد نگہت سلطانہ عدالت میں جا پہنچی۔ لیکن واقعہ چونکہ شاہ نور اسٹوڈیو میں ہوا تھا جہاں "میڈم" یعنی "بے بی" "نور جہاں۔ بے تاج ملکہ کی مانند حکومت کرتی ہے۔ اس لیے استغاثہ ناکام رہا۔ لیکن حادثہ نے شوکت اور نور جہاں کے دلوں میں زہر بھر دیا۔ دونوں ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے رہنے لگے۔ اس واقعہ سے نور جہاں کے پُرانے محبوب نذر کو نور جہاں کے قریب آجانے کا موقع مل گیا۔ نور جہاں بھی ہموار ہو گئی۔ دونوں کی نئے سرے سے ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔

نذر اور نور جہاں کی عشق بازی کا یہ سلسلہ نہ جانے کب تک جاری رہتا اور یہ انتقامی محبت نہ معلوم کیا صورت اختیار کر لیتی کہ نور جہاں کی ایک ذاتی خادمہ نے شوکت کو دونوں کی ملاقاتوں سے آگاہ کر کے سب کچھ چوپٹ کر دیا۔

اور آخر ایک دن، جب کہ نور جہاں اپنے عشرت کدہ میں نذر کی آغوش میں مچل رہی تھی کہ شوکت نے دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لینے کے لیے چھاپہ مارا۔ اس بے جا مداخلت پر جب دونوں نے خطرہ محسوس کیا تو نذر اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر دوسری منزل کی کھڑکی میں سے کود پڑا۔ انجانی جگہ اور اندازے کی غلطی کے باعث نذر اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا اور کلائی کی ہڈی تڑوا بیٹھا۔ اور یوں نور جہاں

کے عشق میں کرکٹ کا نامور کھلاڑی ہمیشہ کے لیے کرکٹ کے کھیل
سے محروم ہو گیا۔!

اور نورجہاں بدستور شوکت کے لیے سرورِ جان بن گئی۔

نورِ جہاں کا خاوند بانکا چھبیلا سید شوکت حسین رضوی موجود ہے۔ اس کی خوبصورت اولاد ہے۔ وہ مال ہے۔ اس کے لیے لاہور کا حجام اپنی ران کا نہیں تو اپنے بازو کا پاؤ بھر گوشت دے سکتا ہے۔ اس کا چار برس کا معصوم عاشق شاہد جلال عرف ٹاکو ہے جو ہر وقت اس کو دلہن بنانے کے خواب دیکھتا رہتا ہے۔ وہ باورچی ہیں جو اس کی تصویر چولھے کے پاس رکھ کر کھانا پکاتے ہیں۔ جو برتن مانجھتے وقت اس کے گائے ہوئے گانے اپنی کن سُری آواز میں گاتے ہیں۔ اور یوں اپنی مشقت کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔ اور ایک میں ہوں کہ جو اُس کی واہیات انگیا دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں — معلوم نہیں، وہ اتنی اُٹھان میں کیا خوبصورتی دیکھتی ہے۔ اور سید شوکت حسین رضوی اس زیادتی کی اجازت کیوں دیتا ہے، جو باذوق نگاہوں پر بہت گراں گزرتی ہے